For more books visit www.4Urdu.com

A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

Ghulam Abbas, I am really happy
You are here!

ooo

For more books visit www.4Urdu.com

- ## کچھ "یاخدا" کے بارے میں

URDU4U.COM

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب میں کراچی پہنچا تو چاروں طرف سے لٹے پٹے' کٹے پھٹے مہاجرین کا ایک سیلاب عظیم پاکستان میں امڈا چلا آ رہا تھا۔ انہی میں کہیں میرا ایک نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچوں سمیت بھی شامل تھا۔ وہ کئی ماہ پہلے مشرقی پنجاب کے گاؤں چمکور صاحب سے کسی قافلے میں روانہ ہوا تھا۔ اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر پہنچا ہے تو کہاں پر ہے۔

اس عزیز کی تلاش میں ایک ایک کر کے میں نے تقریباً تمام مہاجر کیمپوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہجرت کا اصلی اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس بھٹی سے گزرتے ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر یا دفتروں کی چار دیواری میں اعداد و شمار کے گوشوارے بنا کر یا جلسوں اور جلوسوں میں دھواں دھار تقریریں سن کر ہجرت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی مہاجر خانوں میں سسکتے ہوئے' تڑپتے ہوئے ایڑیاں رگڑتے ہوئے اور اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے مہاجرین کی داستان پوری طرح سنائی دیتی ہے۔

اپنی اس تلاش کے دوران ظلم' بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے ہوئے لاکھوں مہاجرین میری نظروں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی۔ درجنوں نے تڑپ تڑپ کر' رو رو کر بین کرتے کرتے مجھے اپنی بپتا بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کربناک مجموعی مشاہدے نے اندر ہی اندر سلگ سلگ کر آخر ایک روز دلشاد کا روپ دھار لیا۔ ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فجر تک ایک ہی نشست میں "یا خدا" کی کہانی مکمل کر کے اٹھا۔

یہ طویل افسانہ سب سے پہلے "نیا دور" کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد احباب کا اصرار ہوا کہ ناولٹ کے طور پر اسے کتابی صورت میں بھی ضرور چھاپنا چاہیے۔

For more books visit www.4Urdu.com

محترمہ ممتاز شیریں مرحومہ نے ایک دیباچہ تحریر فرما دیا اور "یا خدا" کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ عام قاری کو یہ اتنا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چھ ایڈیشن نکل گئے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے اس ناولٹ کا نام "یا خدا" کی جگہ "آزادی کے بعد" رکھ کر بھی کچھ کاروبار کیا۔

"یا خدا" کے کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند مصنّفین کی صف میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ کئی مہینوں تک بڑے بڑے مقتدر رسالوں میں اس کے خلاف خوب لمبے لمبے تنقیدی مضامین آتے رہے۔ میں نے کسی تنقید کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا' کہ یہ نقاد اگر حق بجانب ہیں تو یہ کہانی بہت جلد مردہ ہو کر دفن ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے ۳۷ سال سے ایسا نہیں ہوا۔ مخالفانہ تنقید کسی کو یاد بھی نہیں۔ البتہ "یا خدا" کے ایڈیشن پر ایڈیشن باقاعدہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ اللہ کا فضل اور پڑھنے والوں کا کرم ہے۔

آج کل کالجوں کے نوجوان طلبہ کے کچھ طبقوں میں یہ کتاب خاص طور پر پسند کی جا رہی ہے۔ بہت سے لڑکوں اور لڑکیاں "یا خدا" کی جلدوں پر آٹو گراف لینے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حیرت سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ "کیا واقعی ہمارا وطن ایسے واقعات سے گزرا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو دوسرے ادیب کیوں نہیں لکھتے؟" وغیرہ وغیرہ

"یا خدا" کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالنے کے لیے میں یہاں پر تین دستاویزات کی نقول درج کر رہا ہوں۔

اول : محمد حسن عسکری کا خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۴۸ء بنام محترمہ ممتاز شیریں۔

دوم : اگست ۱۹۵۰ء کے ادب لطیف لاہور میں ابوالفضل صدیقی کا مضمون بعنوان "یا خدا" اور اس کا دیباچہ۔

سوم : "نوائے وقت" کے ایک نوجوان صحافی اظہر سہیل کے تاثرات جو لاہور' راولپنڈی' ملتان اور کراچی کے میگزین سیکشن ۲۹ مارچ تا ۴ اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

○ محمد حسن عسکری کا خط

ممتاز شیریں کے نام
معرفت مکتبہ جدید' انارکلی لاہور
۲۰ جولائی ۱۹۴۸ء

محترمہ' آداب!

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ میں نے اسی وقت قدرت اللہ شہاب کی کتاب "یا خدا" پڑھ کر ختم کی ہے۔ سب سے پہلے تو میں اپ کو ایسا "دیباچہ" لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے بڑے بے لاگ طریقے سے اور بالکل بے جھجک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے جس طرح فسادات کے متعلق انسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ مجھے بہت پسند آیا۔ خصوصاً کرشن چندر کے متعلق تو آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے اور آپ کسی کی رو رعایت نہیں کرتیں۔ ہمارے ادیب اس خوف سے اپنی زبان بند رکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی ہندو دوست برا نہ مان جائے یا ہمیں رجعت پسند نہ سمجھ لیا جائے۔ اس قسم کا خوف ہمارے قومی نقطہ نظر سے جو کچھ بھی ہو' خالص ادبی نقطہ نظر سے بھی بڑی پست چیز ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی مسرت ہوئی کہ ہمارے یہاں کم سے کم ایک لکھنے والے نے تو دیانتداری برتی۔ میں تو یہ ذرا بھی نہیں چاہتا کہ محض قومی فائدے کے لیے لوگ اپنی اصلی رائے کی چھپائیں یا حقیقت کو مسخ کریں۔ اگر ہمارے یہاں واقعی کوئی ایسا آدمی ہے جو Rimbaud کی طرح کا کوئی Vision اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ پاکستان کی بربادی کی دعائیں مانگتا ہے تو میں اس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اسے اظہار کی پوری آزادی دوں گا۔ اور اس کے حق کی حمایت میں قائداعظم تک سے لڑنے کو تیار رہوں گا' مگر دکھ تو اس بات سے

For more books visit www.4Urdu.com

ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب محض دوسروں کو خوش کرنے کے لیے یا دوسروں کے کہنے سے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نفرت یا کم سے کم بد ظنی پھیلاتے ہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے تو عوام کے ووٹوں کی ضرورت تھی' ان پر نام نہاد Intellectuals کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عوام نے پاکستان حاصل کر لیا' لیکن پاکستان کا استحکام محض ووٹوں سے تو نہیں ہو سکتا اس کے لیے تو پوری قوم کی ذہنی اور اخلاقی کاوش کی ضرورت ہے' اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی سے بڑی باتوں تک میں پڑھے لکھے لوگوں کی پوری جدوجہد کے بغیر ہمیں استحکام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمارے ادیب ہیں کہ وہ پاکستان ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور وہ بھی اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں' محض غیر جانبداری' آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا تمغہ حاصل کرنے کے لیے۔ ان حالات میں تو یہ بڑی مبارک فال ہے کہ آپ مسلمانوں کی طرف سے بولیں اور آپ نے اس سازش کا پردہ فاش کیا جو ادب کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس پر آپ کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ کیونکہ یہ بات تو ذرا مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی ادیب اس حد تک مسلمانوں کا حامی ہو' پھر آپ نے کوئی جذباتی بات بھی نہیں کی' سیدھی سیدھی دو اور دو چار والی باتیں کی ہیں۔ میں اس بات کو پاکستان کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں سمجھوں گا کہ پاکستانی ادیب ہر بات میں قوم یا حکومت کی حمایت کرنے لگیں۔ یا ہر بات کو صرف قومی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔ میں تو صرف و محض معروضیت اور سچی غیر جانبداری چاہتا ہوں' اور قوم کی سچی تعمیر کا راز اسی میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آج کل فرانس میں "ذمہ دار ادب" کا بڑا چرچا ہے۔ اس کے متعلق Andre Gide نے کہا تھا۔

I count only on the deserter

میں تو اس مقولے کا بری طرح قائل ہوں۔ اگر میں اپنے لیے کسی شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوں تو "وفادار" کی حیثیت سے نہیں بلکہ بھگوڑے کی حیثیت سے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ Gide افریقہ میں Resistance Committee

For more books visit www.4Urdu.com

Writer's کا سیکرٹری بھی تھا۔ (حالانکہ بعد میں آراگون صاحب نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ژید پر مقدمہ چلایا جائے' کیونکہ وہ جرمن سپاہیوں کے رویے کے تعریف کرتا ہے' تو ایسے نازک وقت میں تو ژید تک قومی خدمت پر آمادہ ہو گیا تھا' کیونکہ اس وقت ذہنی ایمانداری کا تقاضا یہی تھا۔ مگر ہمارے یہاں ایمانداری صرف اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ پاکستان کی مخالفت کی جائے یا جو ادیب ایسے ہیں جنہوں نے قہر درویش بجان درویش پاکستان کے وجود کو تسلیم کر ہی لیا ہے۔ وہ بے تعلق رہنا چاہتے ہیں' بلکہ پاکستان کی عملی حمایت کا مطلب جاہ پرستی سمجھتے ہیں۔ یہاں چند نوجوان ایسے ادیبوں کی ایک نئی انجمن بنانا چاہتے تھے جو پاکستان کے وفادار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے تاثیر صاحب کو بھی شرکت کے لیے راضی کر لیا۔ لیکن جب یہ نوجوان قیوم نظر صاحب وغیرہ کے پاس گئے تو انہیں یہ جواب ملا کہ تاثیر اور عسکری کو کسی ملازمت کی تلاش ہے۔ ادیبوں کے انجمن بنا کے اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتے ہیں تا کہ لمبا ہاتھ مار سکیں۔ اب بتایئے کہ ایسے عالم میں آدمی کیا کرے کیا نہ کرے' ترقی پسندوں نے میرے بارے میں یہ اڑا رکھا ہے کہ اسے حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ غرضیکہ بولیں تو یہ سب سنیں' اور چپ کیسے رہیں' قوم کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تو آپ کی یہ تحریر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ خدا کرے کہ آپ زیادہ لکھا کریں۔ ہماری ضرورت تو قوم کو اسی وقت ہے۔ کہیں تریاق بعد از وقت نہ پہنچے۔

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر پاکستانی کے گھر میں ہونی چاہیے۔ اگر شہاب صاحب پسند کریں تو میری یہ رائے اپنی کتاب کے اشتہار میں دے دیں۔ میں اس پر اخبار "امروز" میں تبصرہ کر رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ اخباروں میں اس پر تبصرہ ہو جائے۔ خیر' یہ کوئی لافانی افسانہ تو نہیں ہے مگر اپنے مقصد کے پیش نظر بڑا کامیاب ہے۔ آخر Vercors کی Silence of the Sea ہی کون سی لافانی ہے؟ یا اس قسم کی دوسری کتابیں۔ مگر پھر بھی

For more books visit www.4Urdu.com

ان کتابوں کا ایک مقام ہے' اور ان مصنفوں کی قومیں بجا طور پر ان کی شکر گزار ہیں۔ شہاب صاحب بھی اسی طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے غیروں کے مظالم دکھانے پر اتنا وقت صرف نہیں کیا' جتنا اپنوں کے مظالم پر۔ کتاب کا تیسرا حصہ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ با اثر ہے۔ خصوصاً آخری سین کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ میں کتاب پر مفصل تبصرہ کر رہا ہوں۔

URDU4U.COM

خیر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ذہنوں پر سے ترقی پسند کی دھند تو چھٹنے لگی۔ شہاب صاحب کو میری مبارکباد پہنچا دیجئے۔

ذرا یہ تو بتایئے کہ کراچی کا ادبی ماحول کیسا ہے۔ کتنے لوگ پاکستانی ہیں اور کتنے ترقی پسند؟ ذرا جلدی جواب دیں تو اچھا ہے۔ صمد شاہین صاحب کو آداب!

نیاز مند ------- محمد حسن عسکری

○ "یا خدا" اور اس کا دیباچہ

ابوالفضل صدیقی!

ادبی تخلیقات کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اتنی ہی ان فنکاروں کی پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ جن کے یہاں انفرادیت ہوتی ہے اس دلچسپ حقیقت کو ہم نے اردو ادب میں بھی دیکھ لیا ہے۔ بیدی' کرشن چندر' عصمت اور دو ایک نام اس فہرست میں اور اضافہ کر لیجئے جنہوں نے اردو افسانہ نگاری میں انفرادیت کی کچھ ایسی مہر لگائی اور اپنی بے پناہ فکر و استعداد سے پیچھے آنے والے ادیبوں کو اس طرح متاثر کیا کہ ۱۹۴۳ء کے بعد ہر نیا ادیب انہی افسانہ نگاروں کی دنیا میں کھو کر رہ گیا۔ کرشن چندر' ان داتا کے بعد آہستہ آہستہ انحطاط کی جانب مائل ہونے لگے۔ بیدی نے ادب کو کبھی کبھار کا مشغلہ بنا لیا اور عصمت جنس سے نکل کر جب مزدوروں اور کسانوں کی دنیا میں آئیں تو اپنے پیچھے چلنے والوں سے بھی پیچھے رہ گئیں۔ جب ہمارے ادب کا یہ حال ہو تو ایسی

For more books visit www.4Urdu.com

صورت میں جب کوئی بت شکن اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر خواہ بڑے پجاری اور پرانے بت کتنے ہی خفا اور جزبز کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک سچا نقاد داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت اللہ شہاب ۴۳ء کے بعد کا ایک بہت بڑا بت شکن ہے جس نے اپنے افسانوں سے صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ بتوں اور پجاریوں کی صفوں میں ایک عجیب انتشار سا بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس کا آخری افسانہ "یا خدا" تو اس منزل کا سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر ہمیں نہ معلوم کتنے لات و منات اور فنی پجاریوں کو تلملاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانہ پر جب لوگوں کی برہمی کا اظہار دیکھا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں غلط طور پر اس سے متاثر ہو گیا ہوں اور تقاضائے بشریت کے تحت جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں اور افسانہ کے موضوع کی سنگین قسم کی رنگینی میں گم ہو کر اسے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں بہترین خیال کرنے لگا ہوں۔ لیکن آج پھر ایک بار بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف میرا پہلا خیال صحیح ہی تھا بلکہ دوبارہ مخصوص نظر سے پڑھنے کے بعد میری رائے راسخ تر ہو گئی اور نہ صرف رائے راسخ تر ہو گئی بلکہ مجھے اس میں چند خوبیاں ایسی نظر آئیں جن پر پہلے مطالعہ میں نگاہ نہ پہنچی تھی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی برہمی کے پردے میں کچھ اور ہے جس کی تشریح کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ "یا خدا" پر برہمی کیوں؟ جب سجاد ظہیر اور احمد علی انگارے میں پرانی اقدار پر چوٹ کرتے ہیں۔ جب کرشن چندر بڑے بڑے ان داتاؤں کی زراتی کا بھانڈا پھوڑتا ہے' جب عصمت لحاف کا موٹا پردہ چاک کرتی ہے اور منٹو ادبی بھٹی کے ہون کنڈے دھواں اٹھاتا ہے تو آپ انہیں بڑا فنکار مان لیتے ہیں حالانکہ انہی افسانوں پر ایک خاص سکول کے افراد تلملا اٹھتے ہیں۔ لیکن جب قدرت اللہ شہاب غریب' سڑے گلے سماج کے رستے ناسوروں اور مبروص سیاست کے گینگرینوں (Gangrenes) کی پٹیاں ہٹا کر نقاب کشائی کرتا ہے تو وہ عقاب قسم کے لوگ بھی بگڑ جاتے ہیں جن کا دعویٰ

For more books visit www.4Urdu.com

ہے کہ وہ سورج جیسی حقیقت سے بھی آنکھیں چار کرنے کی تاب رکھتے ہیں۔ فنکار چند بندھے ٹکے ریاضیاتی فارمولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایک فنکار ہے اور سچا فنکار تو اسے براہ راست زندگی اور اس کی پہنائیوں میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر وہ صرف اخبار کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر اپنے فارمولوں کی مدد سے "تقسیم" اور "ضرب" اور "ضرب" اور "تقسیم" کا عمل کرے گا۔ تو چاہیں اسے کچھ اور کہہ لیں لیکن وہ "فنکار" نہیں ہے اور ترقی پسند ادب تو بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ ترقی پسندی مصلحت کی قائل نہیں۔ یہاں زخموں پر پردہ نہیں ڈالا جاتا یہاں پھوڑوں کو دبایا نہیں جاتا۔ وہ انہیں عریاں کرتا ہے۔ خواہ سیاست اور مصلحت اندیشی چیختی اور کراہتی ہی کیوں نہ رہے۔ حقیقی معنوں میں ترقی پسند فنکار ایک ماہر سرجن کی طرح "چر" سے نشتر لگا دیتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب پر چونکہ نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں وہ تنقید سمجھتا ہوں' جسے ادب کی تو بالکل ہوا ہی نہیں لگے گی۔ البتہ اس میں نہایت گہری قسم کی سیاسی دور اندیشی کے نشانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر جب یہ تنقید کرنے والے اپنی ان تنقیدوں کے ادبی اصولوں پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر داستان گوئی کے عشرت خانے سے نکل کر تنقید کے میدان میں آنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ایسا قلسم ہاتھ میں لے کر جو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو اور جو اس غلیظ تنقید کا خاتمہ کر دے۔ میں ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہوں۔ تخلیقی ادب کی میرے نزدیک اہمیت بھی زیادہ ہے اس لیے نہ تو تنقید کو میں اپنا ادبی مشغلہ بنا سکتا ہوں اور نہ ہر نئے اور پرانے ادیب و شاعر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجارہ داری کا بوجھ میرے نحیف شانے سنبھال سکتے ہیں۔

اس لیے میں قدرت اللہ شہاب کے کہنے والوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر قدرت اللہ شہاب کے بارے میں چند باتیں کہنی نہایت ضروری سمجھتا ہوں اس لیے کہ میری ادبی ایمانداری اور فنی خلوص بار بار مجھے اکسا رہا ہے کہ اس ہنگامہ میں جبکہ سیاہ و سفید کی تمیز دنیا کے کسی شعبہ میں باقی نہیں رہ گئی تو کم سے کم ادب کے چشمہ کی صاف پھواروں کو ہر قسم کی آمیزش بچانا ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی فرض ہے

For more books visit www.4Urdu.com

اور ایسے موقع پر چپ بیٹھے رہنا بھی ایک بڑا فنی جرم ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری اور میرا نام دیکھ کر ممکن ہے کہ لوگ پہلی نظر میں یہ خیال کریں کہ اس مضمون کے ترکش سے کوئی نیا تیر چھوٹے گا' لیکن جب وہ یہ مضمون پڑھیں گے تو انہیں بڑی مایوسی ہو گی کہ انہی کے گروہ کا ایک خادم ادب جس کا ترقی پسندی پر پورا ایمان ہے' آج اپنے ہی اصولوں کی بنا پر ایک سچی بات کہنے میں اس کی بالکل پروا نہیں کر رہا ہے کہ خود اس کے اپنے حلقہ سے کتنی آوازیں اس کے برعکس اٹھ چکی ہیں۔

اس ہنگامہ نے مجھے قدرت اللہ شہاب کے تقریباً تمام پچھلے مشہور افسانے پڑھنے کے لیے اکسایا۔ میں پچھلے دو تین سال سے ہر نئے اور پرانے افسانہ نگار کی تخلیق کو ذرا غور کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کتنے افسانے ایسے ہیں جو ادبی اور افسانوی معیار پر پورے اترتے ہوں۔ میری رائے ناقص میں ان افسانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہی معدودے چند افسانوں میں چند افسانے قدرت اللہ شہاب کی جدت و قدرت فکر کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو قدرت اللہ شہاب کے یہاں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کی شخصیت ہمارے سامنے مکمل طور پر ابھر کر آ جاتی ہے۔ اور افسانہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے اور یہی ایک چیز ہے جس نے شہاب کو نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور ایک حساس شاعر کے ساتھ ایک منفرد انشاء پرداز بھی بنا دیا اور ہر جہتی طور پر وہ ایشیا کا ایک عظیم فنکار ہے جس کے پاس گھلاوٹ اور شیرینی کے خوشگوار گھونٹ ہیں۔ جس کی آستینوں میں طنز و تشنیع کے تیز نشتر اور مسموم پیکان ہیں جس کی دستار پر بانکپن اور تیکھے پن کے

رنگین طرے لہرا رہے ہیں اور اس کو یہ تمام چیزیں ان تمام افسانہ نگاروں سے ممیز

For more books visit www.4Urdu.com

کرتی ہیں جو سپاٹ اور بے جان طریقے سے ایک "اچھی بات" کو پیش کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہیں۔ "اچھی بات" کا تو میں بھی قائل ہوں لیکن اچھی بات، اچھے طریقے سے پیش نہ کرنا بھی "بری بات" سے کم نہیں۔ ادب میں موضوعات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ ایک دور کے اکثر ادیبوں کا تجربہ اور مطالعہ تقریباً ایک ہی سا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں جو چیز امتیازی شان پیدا کرتی ہے وہ ان کے پیش کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ ادب میں "ابلاغ" کو بہت اہمیت ہے۔ آپ کے پاس خواہ کتنا ہی عمدہ موضوع ہو لیکن اگر طرز ادا بھونڈا ہے تو صرف موضوع آپ کی ادبی تخلیق کو جاندار نہیں بنا سکتا۔ موضوع اور طرز اظہار کا جسم و روح والا رشتہ ہے اور وہ بھی خوشگوار تناسب کے ساتھ۔ موضوع اور فن کو جن ادباء نے صحیح طور پر جانا ہے ان میں یہ نوجوان افسانہ نگار بھی ہے۔ پہلے پہل ادبی دنیا میں میں نے شہاب کے افسانے دیکھے تو باوجود نام کے نئے پن کے مجھے ان کی انفرادیت نے متاثر کیا اور سب سے شروع کی ہی چند چیزوں میں مجھے شہاب کے اندر مستقبل قریب کا ادبی بت شکن ابھرتا نظر آیا۔ یہ نوجوان فنکار جس سے میں باوجود اشتیاق ملاقات کے بھی ابھی تک نہیں مل سکا ہوں۔ افسانوں میں ہم سے اس طرح ملتا ہے کہ ایک حد تک اشتیاق ملاقات کی تشنگی تسکین بھی پا جاتی ہے اور تیز تر بھی ہو جاتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جب میں قدرت اللہ شہاب سے ملوں گا تو مجھے مایوسی ہو گی یا مسرت! مگر اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت اللہ شہاب جو اپنے افسانوں میں ہمیں چلتا پھرتا اینڈتا نظر آتا ہے جو اپنی کتابوں میں "یک چمن گل، یک نیستاں، نالہ ایک خمخانہ مے" کبھی زہر خند ہنسی ہنستا اور گاہے موسم بہا کے غنچوں والی لطیف مسکراہٹ مسکراتا، کبھی آگ برساتا اور کبھی گل فشانیاں کرتا نظر آتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب تو ضرور اس قابل ہے کہ ہم اس سے محبت کریں۔

"محبت" کا لفظ میں نے خوب سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لیے کہ قدرت اللہ شہاب

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے افسانے کے کرداروں کو ہم پر مسلط کر کے ہمیں متاثر نہیں کرتا بلکہ افسانوں کے کرداروں سے زیادہ اس کا طرز ادا خود افسانہ نگار کی شخصیت کو ہم پر سوار کر دیتا ہے۔

URDU4U.COM

یہ ہے کچھ عجیب سا پہلو' شہاب کی بے پناہ فنکاری کا اور اس مخصوص صفت میں ہمیں دور موجودہ میں اپنی صف میں صرف وہ تنہا ہی نظر آتا ہے۔ شہاب اپنی ادبی تخلیقات میں نہ تو ہمارے پاس ایک بزرگ و رہنما پیغمبر کی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے جس کو دیکھ کر سوائے زانوئے ادب تہ کرنے کے اور کچھ ہمارا فرض ہی نہ ہو اور نہ ایسا بانکا سپاہی جو اتنا طرار ہو کہ اس سے ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا ہو کہ نہ معلوم کس وقت اس کی تلوار ہمیں زخمی کر دے۔ اور نہ ہاتھ میں پوائنٹر لیے بلیک

بورڈ کی طرف اشارہ کر کے لیکچر دیتا ہوا' سکول ماسٹر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کا شہاب تو ایک "یار" کی صورت میں سامنے آتا ہے اور رخصت ہوتے وقت ایک جدید قربت' ایک نئی ہم آہنگی ایک مزید خلوص چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانے پڑھتے وقت ہم خود کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ذہنی طور پر ہی نہیں صریحاً مادی طور پر ایسا محسوس ہوتاہے کہ شہاب ہمارے گلے میں بانہیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لیے پھر رہا ہے وہی دنیا جہاں "تلاش" ہے۔ جہاں بے بس و مجبور روح انسانی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کیا مجھے سچی محبت کبھی نہ مل سکے گی؟ جہاں سب کا مالک بنگال کی گنگناتی ہوئی وادیوں میں بھوک کی کھیتیاں اگاتا ہے اور جہاں رینابوس مالک کے سامنے بل کھا کھا کر ناچتی اور اہل ہوس کی ہوس صرف اس لیے بھڑکاتی ہے کہ اس کو بھوک کی موت کے چنگل سے ہوس کے سیاہ دامن میں پناہ مل سکے۔ یہ دنیا ہمیں جلترنگ' سٹینوگرافر' غریب خانہ' ایک رات کی بات' ماما اور دو رنگا کے محوروں پر گھومتی سینما کے سکرین کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان افسانوں میں ہمیں ایک زبردست طنز ملتا ہے جس کے تیکھے پن کی نشریت' نہ صرف شہاب کو رومانیت کے کوچے ہی سے نکال لاتی ہے

For more books visit www.4Urdu.com

بلکہ یاسیت کے گھروندوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہے۔ شہاب کے یہاں نمایاں شخصی انفرادیت ہے۔ لیکن وہ انفرادیت نہیں جو عام انفرادیت پسند ادباء کے یہاں پائی جاتی ہے وہ گھٹن اور تلخی اور ابہام جوان افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ شہاب کے یہاں بالکل نہیں ہے اور سماجی احساس سے ہٹ کر چلنے کی روش کا کہیں پر پتہ نہیں ہے۔ شہاب کے افسانے سماج کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اور اپنے مسائل کو ان کے مسائل کے ساتھ ہی ٹکرا کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں چلتا پھرتا اصلی انسان ہی ملتا ہے ان کے کردار خوابوں کی مخلوق نہیں' بلکہ وہ ایک طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو داخلی طور پر خوش نہیں ہے جس کے سفید لباس کے نیچے بھی زخموں سے چور بدن ڈھکا ہوا ہے جہاں کوڑھ کے بڑے گھناؤنے داغ ہماری آنکھوں کو بند کر لینے پر مجبور کرتے ہیں جہاں کوٹوں کے نیچے بھوکے پیٹ پناہ لیے ہوئے ہیں۔ جہاں دور نگاہی کی روحانی اور جسمانی برص کے دھبے داخلی اور خارجی تعفن سے شامہ و باصرہ پر ضرب کرتے ہیں جہاں اپنی محبوباؤں کے جسم دوسروں کے بستروں کی زینت بنتے ہیں اور خود افسانے کے ہیرو اپنی راتیں دفتر کے کلرکوں اور چپڑاسیوں کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ عورت' روپوں کی بھری تھیلی' چھوکری کا بھرا ہوا جسم یہ ہے۔ وہ دنیا جہاں قدرت اللہ شہاب ہمیں لے جاتا ہے' جہاں پہنچ کر ہم تقاضائے فطری کے تحت آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں تو کبھی بے ساختہ نتھنوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں' وہ کہیں ہمارے باصرہ کو خیر کرتا اور کہیں ہمارے شامہ کو زیر و زبر کرتا ہمیں لیے چلا جاتا ہے اور ہم بیزاری اور اختلاج کی حالت میں اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جسے دیکھ کر ہماری رگ رگ میں کراہت' نفرت اور بیزاری کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کی شرع میں سور کے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک ہر چیز حلال ہے۔

قدرت اللہ شہاب ہمیں رنگ محل در رنگ محل' شیش محل در شیش محل لیے لیے نہیں

For more books visit www.4Urdu.com

پھرتا۔ اس کی دنیا میں غریب خانہ بھی ہے جہاں تھالیوں میں لوگ کتوں کی طرح سپڑ سپڑ کھاتے ہیں اور "غریب خانہ" میں ہمیں مینڈک کی طرح رینگتی ہوئی بوڑھی عورتیں' رعشہ بر اندام بوڑھے' پھولے ہوئے پیٹ' گڑگڑاتے ہوئے بچے' گھگھیاتے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے اور وہ نوخیز لڑکیاں جن کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جنسی بھوک مٹانا پڑتی ہے' ملتی ہیں' غریب خانہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے میاں سے لے کر سقہ اور مہتر تک ہر نوجوان لڑکی اپنا حق سمجھتے ہیں اور جب الڑ دوشیزہ اپنی دنیا سے بھاگ کر شہاب کی دنیا والے غریب خانہ میں پناہ لینا چاہتی ہے تو سہارے کی ہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سا وحشی' حیوان کھڑا ہوتا ہے۔ اس دنیا کی کامنی کوشل جب اپنے ٹھاکر کے پنجے سے نکل کر بھاگتی ہے اور یہاں آ کر پناہ لینا چاہتی ہے تو بقول شہاب' وہ کسی چیز سے ٹکراتی ہے اور منہ کے بل گر پڑتی ہے۔ اور شہاب نہایت خلوص کے ساتھ شروع سے آخر تک گلے میں بازو حمائل کئے کہیں انگلی کے اور کہیں ابروی کے اشارے سے اور کہیں کہیں نہایت آہستہ سے کانا پھوسی کر کے ہر چیز دکھاتا جاتا ہے اور نہایت سلامت روی کی چال سب کچھ بتاتا چلا جاتا ہے۔ آؤ یہ دیکھو یہ میری دنیا' کوڑوں کے انبار والی دنیا' سماجی بھوکوں' سیاسی بھوکوں' اقتصادی بھوکوں والی دنیا' جنسی بھوکوں اور شکمی بھوکوں والی دنیا' نہایت معمولی سی بات کی طرح بغیر مسکرائے غضب کی ڈھٹائی سے' بغیر پیشانی پر ایک ادنیٰ سی بھی چیں لائے ہوئے بلا کی ستم ظریفی کے ساتھ ناظر کے حلق پر کونین کی تہ پر تہ چڑھاتا بڑے انداز میں چلا جاتا ہے۔

میں نے جب شہاب کے یہ افسانے پڑھے تو مجھے ایسے معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار زبردست لاشعوری طور پر جرات اور خدا داد بے باکی کا حامل ہے اور اپنی انگلیوں میں داؤدی معجزہ لے کر آیا ہے جو لوہے کو موم کی طرح گوندھ کر اپنی مرضی کے مطابق زنجیر تشکیل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لیے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں حسن و رعنائی کے بجائے کوڑھ کے بد نما داغ ہیں' روحانی جذام اور جسمانی جذام کی بہتی ہوئی پیپ جس پر مکھیوں کے چھتے بھنبھناتے ہیں' افلاس کی سیاہیوں کے بادل منڈلاتے ہیں

For more books visit www.4Urdu.com

اور گناہوں کی تاریکیوں کی اندھیریاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت نازک مقام ہے اور جب ایک افسانہ نگار ان چیزوں کو اپنے یہاں جگہ دیتا ہے اسے بہت چاق و چوبند ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور کام میں لا کر افسانہ لکھنا پڑتا ہے کیونکہ موضوع کی غیر شعریت اور بے رنگی جو کرداروں اور ماحول کی کراہتوں کی صورت قاری کے سامنے آ کر سرے سے انہیں پڑھنے سے ہی روکتی ہے' چہ جائیکہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے اور میں بھی شہاب کے افسانے ہرگز نہ پڑھتا' اگر ان میں بے پناہ خلوص اور اسٹائل میں اس غضب کی جان نہ ہوتی۔ اس تاریک دنیا کو شہاب کے جاندار اسٹائل نے اور اس پر خلوص زور بیان نے اس قدر روشن اور گوارا بنا دیا ہے کہ بے اختیار شہاب سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کشمیر کی فردوسی وادیوں اور پنجاب کے وسیع میدانوں کے متعلق سبھی افسانہ لکھتے ہیں اور جنسی جذبات کو ابھار کر اپنی کہانیوں میں لذت پیدا کر لینا تو عام رسم اور سہل نسخہ ہے لیکن ایسی کریہہ دنیا میں پیش کر کے اور ہمیں اس دنیا میں دوش بدوش اپنے ساتھ ایسے چلاتا جیسے ہم ہالی ووڈ اور بمبئی کے اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہیں یا سوئٹزر لینڈ اور کشمیر کی وادیوں کا چکر لگا رہے ہیں۔ آج کل کے افسانہ نگاروں میں صرف قدرت اللہ شہاب کی انگلیوں کا معجزہ ہے۔ میں کسی قسم کے تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں آپ ہی بتائیے کہ کرشن چندر سے کشمیر کی رنگین وادیاں چھین لی جائیں اور ندیم سے پنجاب کے گنگناتے روشن میدان لے لیے جائیں' شفیق الرحمٰن سے ڈیرہ دون اور شملہ کے ہرے بھرے نشیب و فراز نکال لیے جائیں' عصمت' منٹو اور مفتی کے یہاں اعصابی تشنج نہ ہو تو کیا آپ ان کے افسانوں کو پڑھیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہےجس کا پوچھنا میری جرات رندانہ ہے اور جس کا جواب بھی کچھ دل گردے والا انسان ہی دے سکتا ہے۔ خوبصورت اور جذباتی موضوعات پر افسانہ لکھ کر مقبول ہونا تو بہت آسان ہے لیکن گھناؤنے موضوعات کو کرید کر مقبول اور ہر دلعزیز بنانا صرف شہاب ہی کے زور قلم کا حصہ ہے اور یہ قلم اس وقت تک

For more books visit www.4Urdu.com

نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک افسانہ نگار کی شخصیت میں وہی بانکپن اور

ویسے ہی ہمدردی اور خلوص نہ ہو جو شہاب کے اندر ہے۔

URDU4U.COM

اب کچھ "یا خدا" کے متعلق ------ شہاب کا یہ افسانہ نہ صرف اس کے پچھلے تمام افسانوں میں بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اس کا شمار زبان اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح قحط بنگال کے افسانوں میں کرشن چندر کا "ان داتا" سب سے زیادہ بھرپور اور موثر افسانہ ہے' اسی طرح قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوے افسانوں میں ہے۔ "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ حقیقت نگاری اور ایسی شدید روح ملتی ہے کہ بعض مصلحت اندیش لکھنے والے اس پر ارتداد و کفر کا فتویٰ صادر کر بیٹھے۔ اپنی عمر میں جن معددودے چند چیزوں سے قاری انتہائی متاثر ہوا کرتا ہے' ان میں ایک "یا خدا" بھی ہے۔

لیکن جب ظہیر بابر اور مجیبۃ حسین کے مضامین دیکھے تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں میں غلط راہ پر تو نہیں جا پڑا ہوں۔ جذبات کی رو میں کہیں رجعت پسندی کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن جب میں نے "یا خدا" کا دیباچہ اور یہ مضامین پڑھے تو یہ محسوس کیا کہ ان مضامین اور "دیباچہ" کو "یا خدا" سے کوئی علاقہ نہیں ہے کیونکہ دیباچہ میں "یا خدا" کے متعلق کہنے کی بجائے کچھ اور کہا گیا ہے اور مضامین میں "یا خدا" سے زیادہ دیباچہ پر بحث کی گئی ہے اور اصل مصنف سے زیادہ دیباچہ نگار پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب بے چارے ایک جانب سے آلہ کار ہیں اور دوسری جانب سے چکی کے دو پاٹوں میں گیہوں کے ساتھ گھن بن کر پسے گئے ہیں اور ان پر کسی اور جذبے کے تحت تیر و نشتر چلائے گئے ہیں اور اس بے مثال افسانہ میں فرقہ پرستی کے ناپاک جراثیم تلاش کئے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانہ کا فریم دیکھ کر پہلی نظر میں ضرور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصویر میں چالاک سیاست دان کی طرح ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے اس کے پیش کرنے والے کے

For more books visit www.4Urdu.com

خلوص میں مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ فنکار کے قلم نے صرف ان احساسات کی عکاسی کی ہے جو ایک مخصوص ماحول میں' ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کردار سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں ظالم و مظلوم کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ ظالم ادھر بھی تھے اور ظالم ادھر بھی اور جانبین میں سے کسی ایک کی بھی یہ منطق ظلم کے لیے وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ پہلے اقدام کس کی جانب سے ہوا۔ ہر ہر مہا دیو اور نعرۂ تکبیر کے نعروں اور جے کاروں میں مٹنے والے وہ مظلوم تھے جنہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک ماحول کا مصنف صرف اپنے ماحول کے مظلوموں کی عکاسی صحت نیت کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہو گئے کہ اس کے ماحول کی حدود کے باہر مظلوم ہیں ہی نہیں۔ ترقی پسند نقطہ نظر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو اس بات کے پیش نظر جانچیں کہ آیا فنکار کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے یا اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کسی سچی بات سے چشم پوشی تو نہیں کر رہا ہے اور اس تصویر کے پیش کرنے میں کہیں افراط و تفریط سے تو کام نہیں لے رہا ہے۔ شہاب کے اس افسانہ کو پڑھ کر جو لوگ اس میں فرقہ واریت کے کیڑے دیکھتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حقیقت کو پیش کر دینے سے خواہ لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں یا حلق کڑوے ہو جائیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہے اور اس کی تلخی یا ترشی مسلم اسے شیریں بنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔

"یا خدا" میں صرف ان لوگوں کو فرقہ پرستی کے کیڑے ملتے ہیں جو یا تو مصلحت اندیش ہیں یا پھر جو ان فسادات میں آگ اور خون کی دنیا سے بہت دور بیٹھے صرف پریس کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے اور رائیں قائم کرتے رہے اور اخباری دور بینوں سے مشاہدہ کر کے افسانے لکھتے رہے اور نہایت سستی قسم کی موٹی مصلحت اندیشی کے تحت جانبین کے ظالموں اور مظلوموں میں توازن رکھتے ہوئے' دونوں قوموں میں صلح کرانے کا فورتھ کلاس قسم کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ خیر ان افسانہ نگاروں کے

For more books visit www.4Urdu.com

جذبہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم اس کے اندر سطحی معصومیت ضرور ملتی ہے اور اگر اس سے قوم کی حالت سدھر سکتی ہے اور نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو ایسا ضرور کرنا چاہیے لیکن ہر فنکار سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے مزاج کو بدل کر اور اپنے اوپر اعتدال و توازن کا خول چڑھا کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے تو یہ چیز بہت بے معنی ہے۔ یہ ایک ٹھنڈی طبیعت کا ادیب تو کر سکتا ہے لیکن شہاب جیسا شعلہ مزاج اور تند طبیعت نوجوان فنکار اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہے' جسے اپنا خلوص اس قدر عزیز ہے کہ خود اپنی تلاشی لیتے ہوئے بھی اسے باک نہیں ہے۔ ایسے ادیب سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنی نوک قلم بجائے حقیقت کی آگ کے مصلحت کی برف میں ڈبو کر لکھے' فضول ہے۔ کیونکہ اس کے پچھلے افسانے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے اندر مصلحت (Compromise) کے عناصر پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

وہ اس مقدس آگ کے دبانے سے مجبور ہے جو انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو دیکھ کر ایک فنکار کے اندر بھک سے بھڑک اٹھتی ہے اور اس شعلہ فشانی کے بغیر شہاب زندہ نہیں رہ سکتا۔ "یا خدا" میں اس کے احساسات کی یہ آگ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کی وسیع انسانی ہمدردی کے جذبہ کو غلط سمجھ کر بد حواسی میں اسے فرقہ پرست کہہ دیا لیکن میں پھر سوچتا ہوں اور بار بار میرے ذہن میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ قدرت اللہ شہاب پر یہ تمام عتاب اس لیے نازل ہوا ہے کہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے اس کو سراہا ورنہ "یا خدا" کی نوعیت وہی تھی جو خواجہ احمد عباس کے "سردار جی" کی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ "سردار جی" میں تو ایک تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے اس میں کوئی بھرپور کردار ملتا ہے' اور نہ ایسی فضا جس کے مطابق ہم ماحول کا تجزیہ کر کے اس چیز پر مطمئن ہو سکیں جو فنکار کہنا چاہتا ہے۔ سردار جی کا آخری حصہ تو اتنا غیر فطری اور بے جان ہے کہ مصنف کی مصلحت اندیشی اور توازن قائم کرنے کا پول نہایت پھس پھسے طریقہ سے کھل جاتا ہے اور افسانہ ایک

For more books visit www.4Urdu.com

بچگانہ کوشش بن کر آپ اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا میں سکھوں سے جو نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے وہ سردار جی کے خاتمہ پر زائل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خاتمہ بہت کمزور ہے اور بچوں کے بہلانے کا جھنجھنا سا بجتا سنائی دیتا ہے۔ شہاب کے افسانہ کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک زندہ سماں ہے اور اس کی فضا میں آپ کو شروع سے آخر تک نہایت خوبصورت یکسانیت ملتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسا تجزیہ جس کی روشنی میں نہ صرف آپ کو فسادات کا صحیح پس منظر معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اس گھناؤنے ماحول سے نفرت ہونے لگتی ہے اور اس نفرت کو ابھارنا اور اجاگر کرنا ہی مصنف کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ شاید ترقی پسند نقاد اس افسانے پر لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ لینن نے کہا ہے۔ "اگر اپنے ماحول کو بدلنا ہے تو سب سے پہلے اس ڈھانچہ سے نفرت کرو۔" قدرت اللہ شہاب جب بھی نفرت کا جذبہ ابھارتا ہے تو کیا اس کا یہ فعل عین ترقی پسند نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کے جراثیم کو ختم کرنے کے لیے صرف دلی کے گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھ کر صلح کی بات چیت کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ فسادات کی بنیاد صرف مذہب یا عقیدہ نہیں ہے اس کی تہ میں بہت سے عناصر کار فرما ہیں۔

عناصر دونوں جگھوں پر یکساں ہیں اور انہی سے مل کر یہ ماحول بنا ہے اس لیے جب تک ان بنیادی عناصر سے نفرت پیدا نہ کی جائے اس وقت تک اس ماحول کا پردہ چاک نہیں ہو سکتا اور اصل جراثیم نہیں مٹ سکتے۔ "یا خدا" کے مصنف کا سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندو یا سکھ سے من حیث القوم نفرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا بلکہ خنجر بھونکنے والے سے زیادہ خنجر بھونکنے کے عمل اور وحشت و بربیت کی جانب ہم متوجہ ہوتے ہیں۔ دلشاد سے ہمیں اس لیے بڑی ہمدردی نہیں ہوتی کہ وہ ایک مسلمان لڑکی تھی اور ملا علی بخش کی بیٹی تھی بلکہ شہاب کے خلوص بیان نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے وقت ہم یہ تو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ کون ہے۔ وہ ہمیں صرف ایک معصوم لڑکی دکھائی دیتی ہے جسے چند وحشی درندے نوچتے

For more books visit www.4Urdu.com

دکھائی دیتے ہیں اور کچھ طرز بیان کا جادو ہم پر ان درندوں کے اس طاغوتی فعل سے ایسا جذبہ نفرت اور لڑکی کی مصیبت پر اپنی ہمدردی بیدار کرتا ہے کہ ہم شیطانی عناصر کے خلاف کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور یہی ایک فنکار کا سب سے بڑا کمال ہے کہ اس کا مقصد قاری کے اندر رچ کر رہ جائے اور جب دلشاد کو عمل کے آثار نظر آتے ہیں تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے اور ہم بلک بلک اٹھتے ہیں مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ مظالم ایک کلمہ گو خاتون پر ٹوٹ رہے ہیں بلکہ دلشاد کے کردار کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک رینگتی ہوئی مخلوق جیسا پیش ہوتا ہے جسے عورت کہتے ہیں۔ اور پھر عورت بے بس و مجبور' عصمت و عفت کی دیوی' جس کے بطن کا مقدس صندوق خالق مطلق نے اپنی تخلیقی شاہکار کی امانت کے لیے منتخب کیا ہے اور دلشاد کا بچہ ہمارے سامنے صرف ایک ناجائز اولاد ہی کی شکل میں نہیں آتا بلکہ اس وحشت اور بربریت کی زندہ تشکیل ہے۔ جب انسانیت دشمن بوالہوس انسان نما درندے انسانی تہذیب و تمدن کے تمام سرمایہ کو ملیا میٹ کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ یہ دلشاد اگر گیتا یا سیتا ہو گی تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مریک سنگھ اور دربار سنگھ اگر شہباز خان اور گلزار خان ہوں گے تو اس عمل میں ماحول کے لحاظ سے ایک ہلکا سا فرق محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن گیتا اور سیتا کی مظلومیت بھی اسی نوعیت کی ہو گی' جیسی دلشاد کی تھی اور ان کی ناجائز اولاد بھی اسی طرح انسانیت کے نام پر طنز و تشنیع کا ایک تیر پھینکتی اور پکار پکار کر کہتی۔ "او میاں ہندوستانی صاحب! دیکھو ہم ہیں بیسویں صدی کی آئینی اور اخلاقی دنیا کے روشن اور سفید صفحہ پر تمہارے ٹپکائے ہوئے کالے دھبے' وہ دھبے جن کی مثال ہندوستان سے باہر اس صدی میں باوجود دنیا کی دو عظیم جنگوں کے بھی کہیں اور نہیں ملتی۔"

"یا خدا" کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے قاری کے اندر ایک وسیع انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد سکھ اور مسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم

For more books visit www.4Urdu.com

پر ہے۔ اس کے کردار اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماحول کو خواہ یوپی میں رکھ لیجئے چاہے بہار میں یا بنگال' آسام اور سندھ میں' اس کی بنیاد نہیں بدل سکتی۔ البتہ دلشاد اپنا نام بدلتی جائے گی۔ وہ کہیں گیتا ہو گی اور کہیں سیتا اور کہیں سعیدہ اور کہیں رقیہ' مگر اس کے ساتھ چند درندے بیدردی سے انسانیت کی بے گور و کفن ننگی لاش کی بوٹیاں نوچتے نظر آئیں گے۔ اب بتایئے کتنا بڑا ظلم ہے اور افسانہ نگار کی کاوشوں کی کتنی بڑی بے قدری ہے۔ جب آپ اپنی خاص عینک سے دلشاد کو صرف مسلمان ہی سمجھ لیں حالانکہ "یا خدا" کے خلوص بیان اور ترقی پسند تنقید نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ دلشاد صرف ایک عورت کی صورت میں نظر آتی۔ ایک مظلوم و بے بس عورت۔ ان کے دل میں دلشاد ہی ہمدردی کرتے وقت خود مسجد اور گردوارے کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کا چور مصنف کے سر تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تصنیف میں کوئی ادبی نشان بھی اس قسم کا نظر نہیں آتا۔ ایک بات اور قابل افسوس ہے کہ اس افسانے کو شائع کرتے وقت قدرت اللہ شہاب نے ممتاز شیریں سے دیباچہ لکھوایا۔ مگر انہوں نے بھی مصنف اور تصنیف دونوں کے ساتھ خلوص کا ثبوت دیا جو شیریں جیسے ممتاز اور بلند پایہ فنکار کے کسی صورت سے بھی شایان شان نہ تھا۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ناقدانہ قوتیں افسانہ کے حسن و قبح پر صرف کرتیں بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف زور قلم دکھایا۔ حیرت ہے کہ ابھی دو سال پیشتر جب محترمہ دور افسانہ نگاری کا جائزہ لینے بیٹھی تھیں تو کرشن چندر انہیں افسانہ نگاری کا دیوتا نظر آتا تھا اور اس کے ردی سے ردی افسانہ میں بھی وہ وہ باریکیاں دیکھتی تھیں اور ایسی ایسی تشریحیں کرتی تھیں کہ بے چارہ افسانہ نگار "مصنف سوچتا ہے کس کی یہ تصنیف ہے" کا مصداق ہو کر دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ رہ جاتا تھا اور "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا مضمون تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے الگ ہوتے ہی انہیں کرشن چندر کے "ان داتا" میں بھی کیڑے دکھائی دینے لگے' حالانکہ اس سے پیشتر مختلف

For more books visit www.4Urdu.com

پہلوؤں سے وہ اس پر قصیدہ خوانی کر چکی تھیں مگر اب نہ معلوم ادب میں کایا پلٹ ہو گئی یا وہ خود کایا کلپ ہو گئیں کہ ترقی پسند فنکاروں کی تمام کوششیں سرے سے مہمل اور بے جان نظر آنے لگیں اور اس کے اظہار کے لیے وہ مواقع کی تلاش میں اس درجہ سرگرم ہو گئیں کہ مناسب اور نامناسب کی تمیز بھی کھو بیٹھیں۔ شیریں جیسی صاحب فکر و نظر سے ہمیں امید اس چیز کی تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ و ارفع استعداد کے مطابق سنجیدگی کے ساتھ "یا خدا" کا جائزہ لیں گی۔ اور اپنے تبحیر علمی کے شایان شان تنقید کریں گی۔ شیر شاہ کی بڑی یا سلیم شاہ کی بڑی کا مقابلہ تو یوں بھی تنقید میں کوئی مستحسن چیز نہیں ہے اور دیباچوں اور تبصروں کو ادبی پالی نانا کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔ خیر ہر شخص کو اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ انہیں اس کی قطعاً آزادی ہے کہ وہ اپنی پچھلی چھ سالہ ادبی خدمت کا گلہ گھونٹ کر ایم اسلم اور قیسی رامپوری کو بیدی اور کرشن چندر پر فضیلت دیں' مگر قدرت اللہ شہاب کو اس اکھاڑے میں اتار کر بیدی اور کرشن چندر سے بھڑانا اور اصولی طور پر غلط ہے۔ انھوں نے قدرت اللہ شہاب کو عقیدت کے ہار پہنا کر اور "یا خدا" کا کچھ "سعدی دیگر است" قسم کا دیباچہ لکھ کر شہاب کے ساتھ ٹھیک نادان دوست والی دشمنی کا ثبوت دیا ہے اور ذاتی اغراض کی بنا پر ایک عظیم فنکار کو آلہ کار بنایا ہے آپ کی غرض پوری ہو یا نہ ہو مگر فنکار کا مطلب تو بگڑ ہی جائے گا۔ اس بنا پر میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو ادب کا خلوص کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ "یا خدا" کا جائزہ لیں۔

ترقی پسند ناقدین سے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ وہ "یا خدا" یا "یا خدا" ایسی اور چیزوں کو تبصروں اور دیباچوں کے سرٹیفکیٹ دیکھے بغیر بھی پڑھا کریں اور انہیں قدرت اللہ شہاب کا یہ شہ پارہ ممتاز شیریں اور عسکری کے دیباچہ اور تبصرہ کے لیبل ہٹا کر پڑھنا چاہیے تھا۔ انہیں معلوم ہوتا کہ قدرت اللہ شہاب کم از کم "یا خدا" تک تو انہی کا ہمنوا ہے اور اس کا مقام انہی کی صف میں ہے اور ممتاز شیریں اسے انہی سے

For more books visit www.4Urdu.com

ٹکرانا چاہتی ہے اور اسے کرشن چندر اور بیدی کی قطار سے ایم اسلم اور قیسی رامپوری کی صف میں گھسیٹ رہی ہیں۔ یہاں پر مجھے ان ترقی پسند ناقدین سے شکایت ہے کہ انہوں نے "یا خدا" پر صرف اس لیے کہ اس پر ممتاز شیریں کا دیباچہ تھا اس کی سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور جذباتیت اور ہٹ دھرمی میں جو فیصلہ صادر کیا وہ نہ صرف علمی و ادبی بد دیانتی ہے بلکہ ترقی پسند اصولوں کے سخت منافی ہے۔ یہ لوگ اس سے پیشتر فسادات نمبر میں "یا خدا" دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے کہ پسند بھی کر چکے ہوں گے۔ مگر ان بے چاروں کو اس پر تنقید کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب اس میں ممتاز شیریں کا مقدمہ شامل ہوا' اس کو پرائی بد شگونی کے پیچھے ناک کاٹنا کہتے ہیں۔

آخر میں پھر عرض کروں گا کہ اس میں شک نہیں کہ "یا خدا" کا دیباچہ ایک قسم کی سازش کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر اس کی بنا پر اصل شہ پارہ کی عظمت سے منکر ہونا اور نہ صرف منکر ہونا بلکہ اس کی خوبیوں کو برائیوں کا نام دینا خود اس ادبی بد دیانتی کے ارتکاب سے کم نہیں جس سے دیباچہ کی تیاری میں کام لیا گیا ہے اور مجھے رجعت پسند دیباچہ نگار کی صف میں ان ترقی پسند تبصرہ نگاروں کو بھی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔

ارے صاحب ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ دیباچہ نگار کی سازش کو بے نقاب کیا جاتا اور "یا خدا" کے مصنف کے متعلق یہ بتایا جاتا کہ کم از کم "یا خدا" تک تو ہماری انجمن کے اصولوں کا سچا ترجمان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اب ایک خاص مقصد کے لیے Exploit کیا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار اپنے اپنے رویہ پر غور کریں۔ خصوصاً تبصرہ نگار حضرات جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے افراد ہیں ذرا اسپورٹنگ سپرٹ سے کام لیں اور "یا خدا" کو انصاف کے ساتھ پڑھیں اور پھر اپنے تبصروں کو' اور ممتاز شیریں اور عسکری کے اظہار خیال کرنے کے قصور "یا خدا" سے معاف کر کے دوبارہ تبصرہ لکھیں' یوں تو تنقید میرا میدان نہیں ہے۔ اور اس میدان میں راقم الحروف نووارد سے زیادہ نہیں اس لیے قدرت اللہ شہاب جیسے عظیم

For more books visit www.4Urdu.com

فنکار اور "یا خدا" جیسے بے مثل شہ پاروں کے شایان شان نہ لکھوں گا اور قرار واقعی تنقید نہ کرنے کا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" لیکن اگر میری اس تحریر پر مصنف' دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار حضرات میں سے کوئی غور کریں گے تو میں اپنی سعادت خیال کروں گا اور اردو ادب کے لیے نیک فال۔

○ نظرے خوش گزرے

یہ بہت پہلے کی بات ہے' شاید ۱۹۵۹ء کی
تب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا کہ والد صاحب ایک چھوٹی سی کتاب لائے اور میں نے دیکھا کہ اسے پڑھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔
اس کے بعد موقع ملتے ہی میں نے وہ کتاب ان کی الماری سے اڑائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی' گھنٹہ بھر میں ختم ہو گئی مگر اسے پڑھ کر مجھے رونا نہیں آیا۔
چار سال قبل' میں نے یہ کتاب دوبارہ پڑھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
تب' ایک دم' جیسے بجلی چمکتی ہے' مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کتاب اس وقت رلاتی ہے جب آپ کا شعور پوری طرح بالغ ہو چکا ہے' اس کتاب کا نام "یا خدا" تھا اور اس کے مصنف تھے' قدرت اللہ شہاب۔ قدرت اللہ شہاب' جو ایک زمانے میں انڈین سول سروس کے ستون تھے' پھر سی ایس پی کے کافی بلند پایہ ستون رہے' آج کل ممتاز مفتی کے معیت میں تصوف کے ایک پورے سلسلہ شہابیہ کے بانی مبانی بنے ہوئے ہیں۔ نستعلیق کتابی چہرے پر نیم متشرع سی ڈاڑھی بھی بڑھا لی ہے۔ یہ الگ بات کہ صوفیوں کی متداول عادت کے برعکس اب وہ مزید نرم دل' مزید آہستہ گو ہو گئے ہیں۔
آج کل انہیں دیکھ کر' ان کی باتیں سن کر بے اختیار صائب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ

For more books visit www.4Urdu.com

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد' پیادہ شود

URDU4U .COM

ان میں اتنی عاجزی اور انکسار ہے کہ لگتا ہی نہیں' یہ شخص کبھی بہت زبردست اور معرکے کا سرکاری افسر بھی رہا ہو گا۔ نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو' رزم میں تو ہم نے دیکھا نہیں مگر بزم میں وہ پاک دل و پاکباز ہی محسوس ہوئے۔
وہ ساری عمر اپنے متعلقین اور وابستگان کو حیران ہی کرتے رہے۔ تب بھی جب صدر پاکستان کے سیکرٹری تھے' تب بھی جب اطلاعات کے سکتر تھے' اور تب بھی جب نوکری چھوڑ کر یونیسکو میں جا بیٹھے' اور ایک روز پتہ چلا کہ خفیہ طور پر وہ اسرائیل کا چکر بھی لگا آئے ہیں۔ تب ان کے ایک مرحوم دوست ابن انشاء نے جو کالم لکھا' اس کی سرخی یہ شعر تھا۔

قدرت اللہ شہاب کی باتیں
ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں

باتیں وہ اب بھی خواب و خیال ہی کی سی کرتے ہیں' یقین نہیں آتا کہ مثنوی کے مصرعہ جیسی دھان پان قامت میں ایسی قیامت کی شخصیت چھپی ہوئی ہے' ان کی قامت مختصر' مگر داستان طویل ہے' اس میں طوفانوں کی شورش بھی ہے اور جذبوں کی یورش بھی۔
گئے دنوں' گئے زمانوں سے ہم نے کبھی کچھ نہیں سیکھا' یہ داستان بھی بلا سے کوئی اثر مرتب نہ کرے مگر سن تو لیجئے کہ اس میں کتنی عبرتیں' کتنی قیامتیں پنہاں ہیں' قدرت اللہ شہاب کی کہانی' خود انہی کی زبانی------

For more books visit www.4Urdu.com

من آنچہ شرط بلاغ است' با توی گویم
تو خواہ از سخنم پند گیرو خواہ ملال

اظہر سہیل

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• آزاد کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس کے چار ہزار سال کے قصص و روایات کا کچھ حصہ "راج ترنگنی" کی کلاسیکی سنسکرت میں درج ہے۔ اس کے برعکس تحریک آزادی جموں و کشمیر کی داستان اگرچہ ظاہری طور پر ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتی ہے' مگر تاحال ادھوری ہے۔ اس کے باوجود تحریک آزادی کشمیر کی ساٹھ سالہ داستان کئی لحاظ سے "راج ترنگنی" کے ہزاروں سالوں پر بھاری ہے۔ جدوجہد آزادی کی اس تحریک کے ایک ایک پہلو پر ایک مستند اور مکمل راج ترنگنی تصنیف ہو سکتی ہے۔ اتنا بڑا کام سر انجام دینا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اس باب میں میں اس ڈرامے کی چند چیدہ چیدہ جھلکیاں ہی پیش کر سکوں گا۔

URDU4U.COM

۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے روز عہد نامہ امرتسر کے ذریعہ انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر ایک ڈوگرہ مسمی گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دی۔ ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل تھا۔ اس نرخ پر یہ سر زمین رشک فردوس بریں تقریباً ۱۵۵ روپے فی مربع میل یا موجود زمانے کے ایک پیسہ میں تقریباً ۲۷۰ مربع گز پر اٹھی۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے انسانوں کی قیمت تقریباً سات یا سوا سات روپے فی کس پڑی۔

گلاب سنگھ کا جانشین رنبیر سنگھ بھی اپنے باپ کی طرح قطعی ان پڑھ اور جاہل تھا۔ البتہ اس نے اپنے ولی عہد پرتاب سنگھ کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ اتالیق ضرور مقرر کیے۔ کہا جاتا ہے' کہ ان میں ایک مسلمان اتالیق کی بہت جلد چھٹی ہو گئی۔ پرتاب سنگھ پڑھائی میں بے حد غبی اور کند ذہن تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اس کے مسلمان

For more books visit www.4Urdu.com

استاد نے اس کو ڈانٹا اور کہا۔ "ابے لونڈے محنت سے پڑھا کر' ورنہ باپ کی طرح جاہل کا جاہل رہ جائے گا۔" یہ بات مہاراجہ رنبیر سنگھ تک پہنچی تو وہ بہت بگڑا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کے اتالیق کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔

URDU4U.COM

مہاراجہ پرتاپ سنگھ انتہائی کایاں اور "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" قسم کا انسان تھا۔ اسے افیون کھانے کی لت تھی جس کی وجہ سے وہ دن بھر خمار آلود غنودگی کی کیفیت میں مبتلا رہتا تھا۔ اس صورت حال کو ڈھال بنا کر وہ اپنی ذات پر ایک مصنوعی مخبوط الحواسی' بے بناوٹی اور کسی قدر احمقانہ حد تک سادگی کا لبادہ اوڑھے رکھتا تھا۔ لیکن اس ملمع کاری کے پیچھے وہ انتہائی چالاک' ہوشیار اور دور رس سمجھ بوجھ کا مالک تھا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ اپنے تعلقات انتہائی استوار رکھتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ سادگی اور درویشی کا ڈھونگ رچا کر وہ ان کے خلاف ظلم و استبداد کے سارے قوانین کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی حکمت عملی سے ڈوگرہ خاندانوں کو ریاست میں سیاہ و سفید کا مالک بنانے میں کمال ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔

میں نے نہایت کم عمری میں صرف ایک بار مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو بچشم خود دیکھا تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ کی کرکٹ الیون کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے مہاراجہ نے اپنے افسروں کی ایک ٹیم کھڑی کر رکھی تھی۔ میرے والد مہاراجہ کی ٹیم میں شامل تھے۔ مہاراجہ بذات خود اس ٹیم کا کپتان تھا۔ لیکن جب وہ کھیلنے کے لیے میدان میں اترا تو اس کا حلیہ بہروپیوں جیسا تھا۔ اس کے سر پر ایک سفید ٹوکرا نما ڈھیلی ڈھالی پگڑی تھی' جس کی پیشانی پر سامنے کی طرف اور دائیں بائیں ہیرے جواہرات سے جگمگ کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کلغیاں تھیں۔ گلے میں رنگ برنگ موتیوں کے بہت سے ہار تھے۔ گھٹنوں تک لمبا نیلے رنگ کا انگلش کٹ کوٹ تھا۔ نیچے سفید پتلون اور سفید بوٹ تھے۔ اس ہیئت کذائی کا ایک گول مٹول اور ٹھگنا سا شخص جب بیٹ گھماتا ہوا وکٹ کے سامنے

For more books visit www.4Urdu.com

آ کر ایستادہ ہو گیا' تو ایسے نظر آتا تھا کہ مکی ماؤس کا رنگین کارٹون کی کتاب کے صفحے سے بھاگ کر امر سنگھ کلب سری نگر کے سبزہ زار میں آ کھڑا ہوا ہے۔ ریذیڈنٹ کی ٹیم کا باؤلر مہاراجہ کی جانب گیند اس قدر آہستگی سے لڑھکاتا تھا جیسے دو سال کے بچے کی طرف پیار سے پچکار کر لڈو پھینکا جاتا ہے۔ اس پر بھی مہاراجہ بار بار وکٹ آؤٹ ہوتا رہتا تھا' لیکن امپائر بلند آواز سے No بال کا اعلان کر کے شاہی سکور میں ایک رن کا اضافہ کر دیتا تھا۔

اگرچہ ریاست میں سرکاری طور پر بجٹ بنانے کا دستور رائج ہو چکا تھا' لیکن مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ذاتی اخراجات کی تفصیل بصیغہ راز رکھی جاتی تھی۔ راج محل کے اخراجات کی ایک مد "ٹٹی پن" کہلاتی تھی۔ قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد مہاراجہ بہادر کو طہارت کرانے پر تین ملازم مامور تھے۔ دو ملازم چھبیس کی ململ کے ایک پورے تھان کو کھول کر اس کے دونوں سرے تھام کر ایک برآمدے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ درمیان میں ایک خاص بناوٹ کی چوکی کا سہارا لے کر مہاراجہ صاحب ململ کے تھان پر مناسب آسن جما کر جھک جاتے تھے۔ تیسرا ملازم چاندی کی گڑوی سے صحیح موقع و مقام پر پانی انڈیلتا تھا اور دوسرے دونوں ملازم آرہ کشوں کی طرح ململ کا تھان آگے پیچھے کھینچ کر مہاراجہ کی صفائی کر دیتے تھے۔ اس عمل کے بعد یہ پورا تھان ان تینوں ملازموں کو دان کر دیا جاتا تھا۔ چھبیس کی ململ اس زمانے میں نہایت اعلیٰ اور مہنگے قسم کے کپڑے میں شمار ہوتی تھی۔ مشہور تھا' کہ مہاراجہ کا "ڈیوڑھی وزیر" (Minister in Waiting) کبھی کبھی اپنے آقا کو دودھ میں کچھ مقدار جمال گوٹہ کی ملا دیا کرتا تھا' جس کی وجہ سے اسے بار بار بیت الخلاء جانے کی حاجت پیش آتی تھی۔ چھبیس کی ململ کا ایک تھان تو حسب دستور تینوں ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا' لیکن اس کے علاوہ باقی سب تھان "ڈیوڑھی وزیر" کے حصے میں آتے تھے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ بے اولاد تھا۔ اپنی جانشینی کے لیے اس نے اپنی برادری کا ایک لڑکا

For more books visit www.4Urdu.com

منتخب کر کے متبنہ بنا رکھا تھا۔ لیکن ہری سنگھ کے باپ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو ریاست کا وارث بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے ریاست کے طول و عرض میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس ساز باز میں راجہ امر سنگھ کو حکیم نور دین سے بڑی مدد ملی۔ حکیم نور دین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے ریاست کا شاہی طبیب تھا۔ اس کے علاوہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دست راست بھی تھا۔

راجہ امر سنگھ کا بیٹا ہری سنگھ انتہائی بد کردار' بد اخلاق' آوارہ گرد' لچا لفنگا اور بدمعاش شخص تھا۔ اس کی جنسی بے راہریوں اور بد قماشیوں کے بہت سے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ مسٹر X کے پردے میں ایک انگریز عورت کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر وہ کافی ذلت' بدنامی اور مالی نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس کے باوجود انگریز حکمرانوں نے پرتاپ سنگھ کے منتخب متبنہ کی بجائے رسوائے زمانہ ہری سنگھ کو ہی ریاست کی گدی پر بٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فیصلے میں طرح طرح کی مالی' سیاسی اور جنسی رشوت کا بھی بہت کچھ عمل دخل تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ ۱۹۲۵ء میں گدی نشین ہو کر اپنے لہو و لعب اور عیش و نشاط کی بد مستیوں میں ایسا غرق ہوا کہ ریاست کے چھوٹے بڑے ڈوگرہ ہندو ملازمین کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمانوں کی آبادی ایک صدی سے زیادہ سکھوں اور ڈوگروں کی غلامی میں ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اب ان کے مصائب میں کئی گنا مزید اضافہ ہو گیا۔ لیکن اسی زمانے میں مسلمانوں کی نئی نسل میں اچانک رد عمل کے ہیجان نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں سری نگر میں شیخ عبداللہ نے "ریڈنگ روم پارٹی" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی زمانے میں جموں میں بھی چوہدری غلام عباس نے اے آر ساغر اور دیگر چند ساتھیوں کے ساتھ

For more books visit www.4Urdu.com

مل کر "ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن" کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں تنظیموں کا ظاہر سماجی لیکن باطن سیاسی تھا۔ انہوں نے ریاست کے مسلمان نوجوانوں کو پلیٹ فارم پر مل بیٹھنے' اپنے ماحول کا جائزہ لینے اور معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کا آہنگ سکھایا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا زیادہ وقت کلکتہ' بمبئی' لندن اور پیرس کے عشرت خانوں میں گزرتا تھا۔ میدان صاف پا کر ریاست کے ہندو اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ مسلمان رعایا کے مال و دولت اور عزت و ناموس کے علاوہ ان کے دین و ایمان پر بھی ہاتھ ڈالنے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں پہلے ریاسی میں ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ پھر کوٹلی میں مسلمانوں کے ایک جم غفیر کو زبردستی جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ جموں میں ایک ہندو پولیس کانسٹیبل نے جان بوجھ کر قرآن حکیم کی سخت بے حرمتی کی۔ ان واقعات نے ریاست بھر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصے کی آگ بھڑکا دی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے اور جلوس شروع ہو گئے۔ خاص طور پر سری نگر میں عبدالقدیر نامی ایک شعلہ بیاں مقرر نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر کے مہاراجہ کی حکومت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اسے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جیل کا محاصرہ کر کے مطالبہ کیا کہ انہیں عبدالقدیر کے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی سننے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دینے سے انکار کر کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ جس میں ۲۷ افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس گرفتار کر لیے گئے۔ تین روز بعد پھر سری نگر میں فائرنگ ہوئی جس میں دوبارہ مسلمانوں کا خون بہا۔ آزادی کے نام پر کشمیر کی سر زمین پر خون کی یہ قربانی آج تک بدستور جاری ہے۔ ۱۳ جولائی کو ہر سال شہدائے کشمیر کی یاد بھی پابندی سے منائی جاتی ہے۔

سری نگر میں ۱۳ جولائی کی وحشیانہ فائرنگ سے سارے برصغیر کے مسلمانوں میں بھی رنج

For more books visit www.4Urdu.com

و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

سب سے پہلے لاہور میں خان بہادر رحیم بخش سیشن جج کی ملتان روڈ والی کوٹھی پر مشورہ کرنے کے لیے چند مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جموں کی Young Men's Muslim Association کی نمائندگی کرنے کے لیے اے آر ساغر بھی اس میں شامل تھے۔ اس میں طے پایا کہ ہندوستان بھر کے سر بر آوردہ مسلمان اکابرین کو اکٹھا کر کے اس بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں فیئر ویو نام کی ایک دو منزلہ کوٹھی میں ایک میٹنگ کے نتیجہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اس میٹنگ میں جو حضرات شامل ہوئے' ان میں علامہ اقبال' نواب سر ذوالفقار علی' خواجہ حسن نظامی' نواب کنج پورہ' نواب باغپت' سید محسن شاہ' خان بہادر شیخ رحیم بخش' عبدالرحیم درد' سید حبیب' اسمٰعیل غزنوی' صاحبزادہ عبداللطیف اور اے آر ساغر کے نام سر فہرست تھے۔ چند دوسرے حضرات کے علاوہ وادی کشمیر کے ایک نمائندے غالباً میرک شاہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے۔

بد قسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین محمود نے کر ڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے۔ یہ قادیانیوں کی ایک سوچی سمجھی چال ثابت ہوئی۔ اس کمیٹی کے قائم ہوتے ہی مرزا بشیر الدین محمود نے ہر خاص و عام کو یہ تاثر دینا شروع کر دیا' کہ ان کی صدارت میں اس کمیٹی کو قائم کر کے ہندوستان بھر کے سرکردہ مسلمان اکابرین نے ان کے والد مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس شر انگیز پروپیگنڈا کے جلو میں قادیانیوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے مبلغین کو جموں و کشمیر کے طول و عرض میں پھیلانا شروع کر دیا تا کہ وہ ریاست کے سادہ لوح عوام کو ورغلا کر انہیں اپنے خود ساختہ نبی کا حلقہ بگوش بنانا شروع کر دیں۔ یہ مہم کافی کامیاب رہی۔ کئی دوسرے مقامات کے علاوہ خاص طور پر شوپیاں میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد قادیانی بن گئی۔ پونچھ کے شہر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی رئیس الاحرار مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پونچھ شہر

For more books visit www.4Urdu.com

پہنچے اور اپنی خطیبانہ آتش بیانی سے قادیانیت کے ڈھول کا ایسا پول کھولا کہ شہر کی جو آبادی مرزائی بن چکی تھی' وہ تقریباً ساری کی ساری تائب ہو کر از سر نو مشرف

URDU4U.COM

بہ اسلام ہو گئی۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت کی آڑ میں مرزا بشیر الدین محمود کی یہ چالبازیاں اور حرکات دیکھ کر علامہ اقبال نے شملہ والی کشمیر کمیٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیر کے متعلق اس تحریک کی اعانت اور سرپرستی فرمانا شروع کر دی' جو مجلس احرار نے بطور خود نہایت جوش و خروش سے شروع کر رکھی تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو جموں شہر میں پہلی بار کشمیر ڈے منایا گیا۔ اے آر ساغر اور ان کے دیگر رفقائے کار نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ریذیڈنسی روڈ پر انجمن اسلامیہ کے احاطے سے مسلمانوں کا ایک جلوس مرتب کر کے شہر بھر میں گھمایا جائے۔ ریاستی حکومت تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے ڈوگرہ فوج کو پہلے ہی سے وہاں پر بھیج دیا تا کہ یہ جلوس نکلنے ہی نہ پائے۔ جلوس کے منتظمین نے خفیہ پیغام رسانی سے کام لے کر انجمن اسلامیہ کے احاطے کی بجائے جامع مسجد میں مسلمانوں کا جم غفیر اکٹھا کر لیا۔ ڈوگرہ حکومت نے صورت حال بھانپ کر ایک مسلمان مجسٹریٹ کو مسجد کے باہر تعینات ک ردیا کہ مزید مسلمان مسجد میں داخل نہ ہونے پائیں۔ اے آر ساغر جب مسجد میں جانے لگے' تو مجسٹریٹ نے انہیں روکا' اور پوچھا۔ "تم اس وقت مسجد میں کیا کرنے جا رہے ہو؟"

ساغر نے جواب دیا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہے ہیں۔

صبح کے آٹھ یا ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "یہ کون سی نماز کا وقت ہے؟"

ساغر صاحب نے حاضر جوابی سے کام لے کر کہا۔ "میں نماز اشراق پڑھنے جا رہا ہوں۔"

مسجد میں داخل ہو کر ساغر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جمع شدہ مسلمانوں کا جلوس مرتب کیا اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتا ہوا جلوس مسجد سے برآمد ہوا۔ اس وقت تک

For more books visit www.4Urdu.com

نیزوں سے مسلح ڈوگرہ فوج کا ایک دستہ بھی میجر محمد خان کی کمان میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ مسلمان میجر نے ڈوگرہ فوجیوں کو حکم دیا کہ جلوس منتشر کرنے کی خاطر وہ اپنے نیزے سے کسی شخص کو زخمی نہ کریں بلکہ ڈرا دھمکا کر جلوس روک دیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے سے میجر محمد خان نے یہ حکم تو صریحاً اپنی ذمہ داری پر دیا تھا لیکن کسی طرح ڈوگرہ فوجیوں کو یہ تاثر بھی دے دیا کہ حکومت کا بھی یہی منشا ہے۔

اس واقعہ کے بعد جب حکام بالا اور مہاراجہ تک یہ خبر پہنچی تو مسلمانوں کے ساتھ اس ہمدردانہ رویے کی پاداش میں میجر محمد خاں کو فوری طور پر فوج سے نکال دیا گیا۔ زندگی کے آخری آٹھ دس برس انہوں نے پاکستان میں انتہائی گمنامی اور مفلسی کی حالت میں گزارے۔ کچھ عرصہ انہوں نے جہلم میں لکڑی کے ٹھیکیداروں کے گوداموں کی چوکیداری کر کے گزر اوقات کی۔ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ حکومت پاکستان یا آزاد جموں و کشمیر کی حکومت میں کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ میجر محمد خان جیسے مرد مجاہد کی قربانی اور خدمت بھی ہماری اعانت کی مستحق ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو پہلی بار "کشمیر ڈے" منایا گیا تھا۔ عین سولہ برس بعد ۱۹۴۷ء میں اسی تاریخ کو پاکستان کا قیام بھی وجود میں آیا۔ اب ۱۴ اگست کو ہر سال "پاکستان ڈے" منایا جاتا ہے۔ لیکن یوم پاکستان کا جشن آزادی اس وقت تک ہرگز شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا' جب تک کہ کشمیر کا ایک بڑا حصہ بھارت کے قبضہ استبداد سے آزاد نہیں کروایا جاتا۔

علامہ اقبال کی سرپرستی میں تحریک کشمیر کی رہنمائی مرزا بشیر الدین محمود کی کشمیر کمیٹی سے نکل کر مجلس احرار میں آگئی تو قادیانیوں نے متوازی خطوط پر اپنی کمیٹی چلانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن احراریوں کے مقابلے میں ان کی دال نہ گل سکی۔ کسی وجہ سے جس کا مجھے علم نہیں قادیانی عرصہ دراز سے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے کا خواب

For more books visit www.4Urdu.com

دیکھتے چلے آئے ہیں۔ ریاست میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ایجی ٹیشن میں انہیں غالباً اپنے اس خواب پریشان کی تعبیر نظر آنے لگی۔ لیکن مجلس احرار نے ان کی یہ امنگیں اور آرزوئیں خاک میں ملا دیں۔

URDU4U.COM

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں پہلے تو احرار کے چند سرکردہ قائدین نے خود سری نگر جا کر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیراعظم سر ہری کرشن کول سے مل کر افہام و تفہیم کے ذریعہ معاملات سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو لاتوں کے بھوت تھے' باتوں سے کیسے مان جاتے؟ مایوس ہو کر احراری لیڈر واپس آئے تو سارا پنجاب "کشمیر چلو' کشمیر چلو" کے نعروں سے گونج اٹھا اور آزادی کشمیر کے متوالے رضا کاروں نے سر پر کفن باندھ کر ریاست کی سرحدیں عبور کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ پہلی یورش سیالکوٹ کی جانب سے شروع ہوئی۔ اس جیالے شہر کے مسلمانوں نے گھر گھر کو جذبہ جہاد کی حرارت سے پگھلا کر رکھ دیا۔ ماؤں نے بیٹوں کو' بہنوں نے بھائیوں کو اور بیویوں نے خاوندوں کو خوشی خوشی دعائیں دے کر ریاست میں داخل ہونے کے لیے رخصت کیا۔ ریاستی حکام کا اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار رضا کار جموں تک آ پائیں گے' جنہیں آسانی سے گرفتار کر کے محبوس کیا جا سکے گا۔ لیکن جب دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار سے بھی اوپر مجاہدین گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے جموں پر چڑھ آئے تو مقامی پولیس بے بس اور بد حواس ہو گئی۔

دوسری جانب میر پور میں بھی تحریک آزادی کے شعلے تیزی سے بھڑک رہے تھے۔ خاص طور پر جب ایک مسلمان سیاسی کارکن کو دن دہاڑے ایک ڈوگرہ افسر نے بر سر عام نوک سنگین سے سینہ چھید کر شہید کر ڈالا تو چاروں طرف غم اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ پنجاب کے کونے کونے سے مسلمان نوجوانوں کے جتھے کلمہ شہادت کا ورد کرتے جہلم کے راستے کشمیر کی سرحدوں کی طرف پاپیادہ روانہ ہو گئے۔ جس طرف سے وہ پیدل مارچ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ "کشمیر چلو' کشمیر چلو" کی صدائے بازگشت کا نقش لوگوں کے دلوں پر چھوڑتے جاتے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

تیسری جانب تیس رضا کار قرآن شریف پر یہ حلف اٹھا کر راولپنڈی سے روانہ ہوئے کہ وہ جان کی بازی لگا کر دریائے جہلم پر کوہالہ کا پل بند کر کے رہیں گے۔ تین دن کی سر توڑ ہمت مردانہ سے کام لینے کے بعد انھوں نے یہ پل اپنے قبضہ میں کر لیا اور اس طرح وادی کشمیر کے ساتھ تجارت کی یہ واحد شاہراہ بند ہو گئی۔ آن کی آن میں دونوں جانب رکی ہوئی گاڑیوں' لاریوں اور ٹرکوں کی طویل قطاریں بندھنا شروع ہو گئیں۔

URDU4U.COM

کچھ رضا کاروں نے گورداسپور اور گجرات کی جانب سے بھی اپنی یلغار شروع کی۔ لیکن ان علاقوں میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ اس لیے یہ محاذ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔

مہاراجہ کشمیر کی درخواست پر ہندوستان کی برطانوی حکومت بھی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئی۔ چنانچہ رضا کاروں کو کشمیر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے اب صوبہ پنجاب میں بھی ان کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ پنجاب کی جیلیں بھی بہت جلد اٹا اٹ بھر کر کم پڑ گئیں۔ شدید بد انتظامی اور ضروری سامان کی کمیابی کی وجہ سے کئی درجن رضا کار نمونیہ میں مبتلا ہو کر جیلوں ہی میں وفات پا گئے۔ کئی مقامات پر جیلوں میں جگہ کی قلت کی وجہ سے پولیس والے بہت سے نئے گرفتار شدہ رضا کاروں کے گلے میں تختیاں لٹکا کر احرار کے دفتروں میں چھوڑ جاتے تھے تا کہ جگہ خالی ہونے پر انہیں جیلوں میں لے جائیں۔ اندازہ ہے کہ صرف پنجاب سے تقریباً ۴۵ ہزار نوجوان گرفتار ہوئے' پانچ ہزار سے زائد رضا کار دوسرے صوبوں سے بھی شامل ہوئے۔

ریاست کے اندر اور باہر مسلمانوں کی منظم ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر نومبر ۱۹۳۱ء میں گلینسی کمیشن قائم کیا گیا۔ سر بی جی گلینسی اس کے صدر اور غلام محمد عشائی' پنڈت پریم ناتھ بزاز اور چوہدری غلام عباس اس کے ممبر تھے۔ کمیشن کے مقاصد میں ریاست

For more books visit www.4Urdu.com

کے مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لے کر ان کے حقوق کی نشاندہی کرنا اور جولائی کی پولیس فائرنگ کے صحیح کوائف کی تحقیقات کرنا شامل تھے۔

URDU4U .COM

دیگر کئی اقدامات کے علاوہ اس کمیشن نے ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی قائم کرنے کی بھی پر زور سفارش کی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دباؤ سے مجبور ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ نے انتہائی بے دلی سے یہ سفارش قبول کر کے ایک اسمبلی قائم کر ڈالی جس کا فریضہ حکومت کو فقط مشورہ دینا تھا۔ اس سے زیادہ اس نام نہاد اسمبلی کے پاس کوئی خاص اختیار نہ تھا۔ ۷۵ اراکین کی اس اسمبلی میں صرف ۳۳ ممبر انتخاب کے ذریعہ لیے جاتے تھے۔ ۲۱ مسلمان اور ۱۲ غیر مسلم۔ باقی ۴۲ ممبر حکومت خود نامزد کرتی تھی۔ اس طرح اس نوعیت کی محدود مشاورتی اسمبلی میں بھی ریاستی حکومت کے اپنے نامزد کردہ اراکین کی تعداد منتخب ممبروں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔

گلینسی کمیشن کے قیام کے ایک برس بعد ۱۹۳۳ء میں سری نگر پتھر مسجد میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ اس کے صدر اور چوہدری غلام عباس جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب اسمبلی کے لیے پہلی بار انتخابات ہوئے تو شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر اسمبلی میں شامل ہوئے۔

سات برس تک شیخ صاحب اور چوہدری غلام عباس کا گہرا' پر خلوص اور برادرانہ باہمی تعاون اور ساتھ رہا۔ مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ان دونوں رہنماؤں نے پاپیادہ چل چل کر ریاست کے چپے چپے میں عوام الناس میں سیاسی بیداری کی زبردست روح پھونکنے کا شاندار کارنامہ سر انجام دیا۔ ان دنوں شیخ صاحب اپنی تقریر قرآن حکیم کی قرات اور اس کے بعد نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے تھے۔ ان کی آواز لحن داؤدی کا سماں باندھ دیتی تھی۔ ان کی تقریر میں آتش بیانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اسی طرح چوہدری غلام عباس بھی سادگی' خوش بیانی' سلاست اور جذبات کی

For more books visit www.4Urdu.com

فراوانی کا بے حد خوبصورت مجسمہ تھے۔ ان دونوں کی تقریروں کو لوگ سحر زدہ سامعین کی طرح مبہوت ہو کر سنتے تھے' تڑپتے تھے اور بعض دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اس قسم کے جلسے میں نے زندگی بھر میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ ایسے جلسوں میں اے آر ساغر کی آتش بیانی بھی فصاحت و بلاغت کی لاجواب فضا باندھ دیتی تھی۔

مسلمان عوام کو ریاست کے طول و عرض میں اس طرح بیدار اور منظم ہوتے دیکھ کر ہندوؤں کے پیٹ میں بھی مروڑ اٹھا اور انہوں نے ڈوگرہ حکام سے مل کر ہندوستان سے ایک جارحانہ ہندو تحریک راشٹریہ سیوم سیوک سنگ (R.S.S) کو دعوت دی کہ وہ جموں اور کشمیر میں بھی اپنے اڈے قائم کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے قیام کے دو برس بعد ۱۹۳۴ء میں آر ایس ایس نے اپنا کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سری نگر' جموں' میر پور' کوٹلی' سانبہ' اودھم پور اور کٹھوعہ کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر بھی اپنے اکھاڑے قائم کر لیے۔ بظاہر ان کا مقصد یہ نظر آتا تھا کہ ہندو نوجوانوں کی جسمانی ورزشوں کے لیے یہ جمناسٹک کلب قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن در حقیقت ان اڈوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے ریاست کی ہندو اقلیت کو جنگی تربیت دے کر کیل کانٹے سے لیس کر دیا جائے۔

ادھر عوامی سطح پر راشٹریہ سیوم سیوک نے اپنا کام شروع کیا' ادھر آل انڈیا کانگرس کی قیادت نے شیخ عبداللہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس سیاسی مہم کے سرغنہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو بنفس نفیس پیش پیش تھے۔ یہ تو غالباً وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کانگرس کے کیوپڈ دیوتا نے شیخ صاحب کے دل پر کیا کیا تیر چلائے' لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کی سات سالہ بے تاج بادشاہی

For more books visit www.4Urdu.com

کے بعد ۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ سیاست اسلامیہ کی ہمالیہ کی چوٹی سے لڑھک کر منہ کے بل گرے اور ہندو کانگرس کی جھولی میں دھم سے آ پڑے۔ زوال کے اس عمل میں ان کے چہرے پر سجی ہوئی نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ریش مبارک آناً فاناً غائب ہو گئی اور ان کے سر کی سج دھج ایک سرک رنگ کی ترکی ٹوپی بھی راستے میں کہیں گر کر کانگرس کی گنگا ماتا میں ڈوب گئی۔ مسلم کانفرنس سے رشتہ توڑ کر شیخ صاحب نے آل انڈیا کانگرس سے فیضان اور وجدان اور رہنمائی حاصل کر کے جموں و کشمیر نیشنل پارٹی کا ڈول ڈالا۔ یہ پارٹی شروع ہی سے آل انڈیا کانگرس کی داسی بنی رہی ہے۔ اس کے برعکس چوہدری غلام عباس کی قیادت میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ غیر مشروط وفاداری سے ساتھ دیا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی اس کایا کلپ کے بارے میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی قیاس آرائیاں اور افواہیں جنم لیتی رہی ہیں۔ اس زمانے میں ایک افواہ جو ریاست کے طول و عرض میں انتہائی شدت سے گردش کر رہی تھی' اس کا تعلق جموں و کشمیر کے وزیراعظم سرگوپال سوامی آئینگر سے تھا۔ یوں تو یہ حضرت انڈین سول سروس کے افسر تھے لیکن در پردہ کانگرسیوں کے ساتھ بھی گہری ساز باز رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد وہ بھارت کی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ شیخ عبداللہ کو کانگرس کی جھولی میں ڈالنے کے لیے وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے انواع و اقسام کی ریشہ دوانیوں سے کام لیا۔ ان میں سے ایک افواہ یہ گرم تھی کہ کسی ہیر پھیر سے انہوں نے شیخ صاحب کو دو کروڑ روپے کا جنگلات کا ٹھیکہ بھی دے دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

برصغیر میں جوں جوں حصول پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا' ریاست میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کا پلہ اسی رفتار سے بھاری ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی ۸۰ فیصد نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں

For more books visit www.4Urdu.com

کی سیاسی بیداری کا یہ حال دیکھ کر ڈوگرہ حکومت بد حواس ہو گئی اور انہوں نے فوری طور پر ریاست میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ فقط راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کو ہر قسم کے جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی آزادی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس نے سیاسی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تو اس کے تمام رہنماؤں اور بے شمار کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فارمولا منظور ہوا تو برصغیر کی ۵۶۲ ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جغرافیائی اور معاشیاتی حقائق کے پیش نظر اپنی اپنی آبادی کی خواہشات کے مطابق بھارت یا پاکستان سے الحاق کر لیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی آبادی ۸۰ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی سرحدوں کے چھ سو میل مغربی پاکستان کے ساتھ مشترک تھے۔ ریاست کی واحد ریلوے لائن سیالکوٹ سے گزرتی تھی اور بیرونی دنیا کے ساتھ ڈاک اور تار کا نظام بھی مغربی پاکستان کے ذریعہ قائم تھا۔ ریاست کی دونوں پختہ سڑکیں راولپنڈی اور سیالکوٹ سے گزرتی تھیں اور کشمیر کی تمام درآمدات اور برآمدات کا راستہ بھی پاکستان سے وابستہ تھا۔ ان سب حقائق کے پیش نظر ریاست جموں وکشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق لازمی طور پر ایک قدرتی اور منطقی فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مہاراجہ ہری سنگھ اور کانگرسی لیڈروں کے دلی عزائم اس فیصلہ کے بالکل برعکس تھے۔ اپنے ان مذموم عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر سازشوں کا ایسا جال بنا جس کے پھندے میں مقبوضہ ریاست کے بے بس اور مظلوم باشندے آج تک بری طرح گرفتار ہیں۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے فارمولے کا اعلان ہوتے ہی سب سے پہلے مہاتما گاندھی اور کانگرس کے صدر مسٹر جے بی کرپلانی فوراً کشمیر پہنچے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ساز باز کر کے اپنی سازشوں کے جال کی منصوبہ بندی کر آئے۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی مہاراجہ کشمیر نے یہ چال چلی کہ حکومت پاکستان کے

For more books visit www.4Urdu.com

ساتھ ایک Standstill Agreement طے کر لیا' جس کی رو سے ریاست کے ڈاک' تار اور تجارتی کاروباری نظام کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان کی سرزمین پر پہلے جیسی سہولتیں بدستور برقرار رہیں گی۔ پاکستان نے اسے مہاراجہ کی خیر سگالی کا مظاہرہ سمجھا تا کہ الحاق کا فیصلہ کرنے سے پہلے ریاست کے ذرائع رسل و رسائل اور درآمدات' برآمدات میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ لیکن مہاراجہ کی جانب سے یہ معاہدہ محض دھوکے کی ٹٹی تھی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے ذریعہ جنرل پوسٹ آفس لندن کو یہ ہدایات بھی جاری کر دیں کہ آئندہ ریاست جموں و کشمیر میں آنے والی سب ڈاک نئی دہلی کی معرفت ارسال کی جائے۔ مہاراجہ کی منافقت میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سمیت بھارتی حکومت کی سازشانہ شرکت یہ ایک بین ثبوت تھا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے بارے میں جب ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو ضلع گورداسپور کی آبادی میں واضح مسلمان اکثریت کے باوجود اسے بغیر کوئی وجہ بتائے انتہائی شر انگیز بد نیتی کے ساتھ بھارت کو دے گیا گیا تھا۔ کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ سکتا تھا' نہ راستہ مل سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ اب ایسے تاریخی آثار و شواہد منکشف ہو رہے ہیں جن سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذات خود اس سازش میں پوری طرح ملوث تھا۔ البتہ یہ بات فی الحال پردۂ راز میں ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کو اس کھلی بد دیانتی' اور نا انصافی کا مرتکب ہونے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کئے۔ ان حربوں میں بڑی بھاری رشوت بھی بعید از قیاس نہیں۔

پاکستان کے ساتھ Standstill Agreement طے ہوتے ہی مہاراجہ ہری سنگھ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جموں کے صوبے میں پوری مسلمان آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس مہم کی کمان مہاراجہ نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر ڈوگرہ فوج' پولیس اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے دستوں کو جگہ جگہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح مسلم رعایا

For more books visit www.4Urdu.com

پر چھوڑ دیا۔ قتل و غارت' لوٹ مار' خواتین کی بے حرمتی اور جوان لڑکیوں کے اغواء کی جو قیامت برپا ہوئی' اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ اس شورش میں جو بے شمار بچیاں اغواء ہوئیں ان میں چھدری غلام عباس کی ایک چہیتی بیٹی بھی شامل تھی۔ بے شمار مسلمانوں کو پناہ کا جھانسا دے کر بسوں اور ٹرکوں میں سوار کیا گیا تا کہ انہیں سیالکوٹ کی جانب پاکستان کی سرحد تک پہنچا دیا جائے لیکن راستے میں ڈوگرہ پولیس کی نگرانی میں آر ایس ایس کے درندوں نے انہیں انتہائی بیدردی سے شہید کر ڈالا۔ صوبہ جموں کے بیشتر علاقے مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب مہاراجہ نے مسلمانان پونچھ کی طرح اپنا رخ پھیرا۔

پونچھ کی آبادی میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ اس آبادی کا ایک کثیر حصہ ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل تھا' جو دوسری جنگ عظیم میں دنیا کے کئی محاذوں پر داد شجاعت دے چکے تھے۔ صوبہ جموں کے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں سن کر ان کا خون پہلے ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ گلگت میں مقامی مسلمانوں نے گلگت سکاؤٹس اور ریاستی فوج کے مسلمان عناصر کے ساتھ مل کر علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور مہاراجہ کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر آزادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔

اس پس منظر میں مہاراجہ کے بہیمانہ عزائم کو بھانپ کر پونچھ کے غیور اور بہادر مسلمانوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے ساتھ الحاق کا عزم بالجزم کر لیا۔ سارے علاقہ میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ گونجنے لگا۔ ڈوگرہ حکومت نے جگہ جگہ اپنی فوج اور پولیس کی تعداد بڑھا کر عوام الناس کو تشدد سے کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کے روز دھیر کوٹ کے قریب نیلابٹ نامی گاؤں میں الحاق پاکستان کے حق میں ایک جلسہ عام ہو رہا تھا۔ ڈوگرہ فوج کے ایک دستے نے وہاں آ کر اس پر امن جلسے پر بلا وجہ گولی چلا دی۔ اس ظالمانہ واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ دو روز بعد سردار عبدالقیوم خاں نے گوریلا مجاہدین کا ایک دستہ منظم کیا اور دھیر کوٹ میں ڈوگرہ

For more books visit www.4Urdu.com

پولیس اور فوج کے ایک کیمپ پر حملہ کر کے اس کا صفایا کر دیا۔

اپنی فوج کی اس شکست فاش پر مہاراجہ ہری سنگھ غیظ و غضب سے تلملا کر دیوانہ ہو گیا۔ اس نے ریاست کے ہر حصے سے ڈوگرہ فوج' پولیس' آر ایس ایس کے دستوں کو مجتمع کر کے اپنے خاص الخاص افسروں کی سرکردگی میں پونچھ کے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ان کو سب سے ضروری ہدایت یہ تھی کہ جتنے مسلمان مرد' عورتیں اور بچے تہ تیغ ہو سکیں انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ باقیماندہ باغیوں کو کسی نہ کسی طرح پاکستان کی جانب دھکیل دھکال کر ریاست بدر کر دیا جائے۔ پونچھ کی آبادی کے قبائل سدھن' عباسی' چب' راجپوت' دانیال اور گکھڑ وغیرہ درانی اور افغانی نسل سے تھے اور پاکستان کے کئی ملحقہ اضلاع مثلاً سیالکوٹ' گجرات' جہلم اور راولپنڈی میں ان کی بیشمار رشتہ داریاں اور عزیز داریاں تھیں۔ ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے تیور دیکھ کر بہت سے مقامی مسلمانوں نے اپنی خواتین اور بچوں کو پاکستان میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں بھیج دیا اور خود سر سے کفن باندھ کر ڈوگرہ حکومت کے ساتھ جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔

دھیر کوٹ میں سردار عبدالقیوم خاں نے بہادری کی جو مثال قائم کی تھی' اس کی تقلید میں اب جگہ جگہ مقامی گوریلا دستے منظم ہو گئے اور انہوں نے پے در پے ڈوگرہ فوج کے چھکے چھڑا کر اپنی سرزمین کو ڈوگرہ حکومت کے پنجہ استبداد سے آزاد کروانا شروع کر دیا۔ کپتان حسن خان اور سخی دلیر نے اپنے اپنے گوریلا دستوں کے ساتھ دریائے جہلم پر پچھمن پتن پل پر متعین ڈوگرہ فوج پر حملہ کر دیا' اور کئی گھنٹے کی شدید دست بدست جنگ کے بعد پل کو صحیح سالم اپنے قبضے میں لے لیا۔ ڈوگرہ فوج پسپا ہو کر پلندری کی طرف بھاگی' تو کپتان حسن خان نے تعاقب کر کے اسے وہاں سے بھگا کر پونچھ شہر کی جانب دھکیل دیا۔ پونچھ شہر کے نزدیک تولی پور کے مقام پر ایک اور شدید معرکہ ہوا جس میں ڈوگرہ فوج نے ایک بار پھر منہ کی کھائی۔ اس معرکہ میں کپتان حسن خان

For more books visit www.4Urdu.com

نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ چھمن پتن کا نام اب آزاد پتن ہے۔ یہاں پر دریائے جہلم پر واقع پل مجاہدین کے قبضہ میں آنے کے بعد ان کا رابطہ کھوٹہ کے راستے راولپنڈی کے ساتھ براہ راست قائم ہو گیا۔

URDU4U.COM

میجر بوستان خان نے اپنے گوریلا دستے سے منگ کے مقام پر حملہ کر کے وہاں پر مقیم ڈوگرہ فوج کی کمپنی کو مار بھگایا۔ اس کے جواب میں راولا کوٹ کے ڈوگرہ کمانڈر نے سارے علاقے میں قتل عام کا حکم دے دیا' اور گاؤں گاؤں میں ایک ایک گھر کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ یہ آتش زنی اس قدر شدید اور وسیع پیمانے پر تھی کہ اس کے شعلے پاکستان میں مری کے باشندوں کو بھی نظر آتے تھے۔ میجر بوستان خان نے ہمت نہ ہاری اور اس کے مٹھی بھر مجاہدین ڈوگرہ فوج کو قدم قدم پر پسپا ہونے پر مجبور کرتے رہے۔

کیپٹن فیروز خان نے اپنے مجاہدین کے گروپ کی مدد سے تراڑ خیل' دیوی گلی' اور ہجیرا کو آزاد کرا پونچھ شہر کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش ایک برس تک جاری رہا۔

میجر نصر اللہ نے کچھ سابقہ فوجیوں کو منظم کر کے راولا کوٹ میں ڈوگرہ فوج کی مضبوط چھاؤنی پر حملہ کیا' اور ادھر ادھر دیہات میں بکھری ہوئی پلٹنوں کو گھیر گھار کر ان کا مکمل صفایا کر دیا۔ مجاہدین کی اس پیش رفت کی تاب نہ لا کر ڈوگرہ فوج راولا کوٹ سے بھاگ اٹھی' اور پونچھ شہر میں جا کر پناہ گزین ہو گئی۔

ان جنگی کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ پونچھ شہر اور اس کے گرد و نواح کا تھوڑا سا رقبہ چھوڑ کر اب باقی سارا علاقہ آزاد تھا۔ یہ آزادی مٹھی بھر گوریلا لیڈروں نے اپنے اپنے طور پر مقامی مجاہدین کو منظم کر کے جسم و جان کی بے مثال قربانیاں دے کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کی تھی۔ ان کے پاس نہ کوئی خزانہ تھا جس سے لڑنے والوں کو تنخواہیں ادا کی جاتیں۔ اور نہ ان کے پاس کوئی رسدگاہیں تھیں جہاں سے کھانے پینے اور گولہ بارود کا سامان باقاعدگی سے محاذ جنگ پر پہنچایا جا سکتا۔ ان کے پاس کوئی فوجی

For more books visit www.4Urdu.com

جی ایچ کیو بھی نہیں تھا جہاں سے سپاہیوں کی وردی' آلات حرب اور مرکزی جنگی حکمت عملی کے متعلق ہدایات جاری کی جا سکتیں۔ گوریلا لیڈروں اور مجاہدین فقط ایک جذبے سے سرشار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک بے لوث اور سچا جذبہ جہاد موجزن تھا۔ وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے جوتے پہن کر اپنے سے کئی گنا زیادہ مضبوط اور مسلح دشمن سے دن رات بے جگری سے لڑتے تھے۔ باد و باراں کے طوفان میں وہ کئی کئی روز اپنی خندقوں میں بھوکے پیاسے پڑے رہتے تھے۔ ان کے معصوم بچے یا ان کی مائیں' بہنیں اور بیویاں اپنے سروں پر راشن لاد کر کئی کئی میل پاپیادہ چلتی تھیں' اور دشمن کی نظر بچا کر اپنے لڑنے والے مجاہدوں کو رسد کا سامان پہنچا دیا کرتی تھیں۔ برفباری کے دنوں میں پاؤں میں صحیح جوتے نہ ہونے کی وجہ سے کئی مجاہدوں اور رسد لے کر آنے جانے والے بچوں اور خواتین کے پاؤں متورم ہو کر لہولہان ہو جاتے تھے' لیکن ان کے دل میں بھڑکنے والا جہاد کا شعلہ کبھی مدھم نہ پڑتا تھا۔

جب پونچھ کا بیشتر علاقہ آزاد ہو کر ڈوگرہ حکومت کی لعنت سے پاک ہو گیا تو رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گوریلا لیڈروں اور مجاہدین کا بھی آپس میں رابطہ ہوتا گیا اور ۱۹۴۷ء کے ماہ اکتوبر کے وسط میں انہوں نے باہمی تعاون سے ایک مرکزی جنگی کونسل قائم کر لی۔ اس کے بعد آزاد شدہ علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں و کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا' جس کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے۔ اس حکومت کے قائم ہونے کے بعد مجاہدین آزادی نے باقاعدہ منظم ہو کر ڈوگرہ حکومت کے رہے سہے اقتدار کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار مربع میل سے زیادہ رقبہ آزاد کرا لیا۔ ان میں وہ معرکے خاص طور پر نمایاں ہیں جن میں کامیاب ہو کر بھمبر' میر پور' کوٹلی' مینڈھر' راجوری اور نوشہرہ کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ پونچھ شہر کا طویل محاصرہ بھی ایک یادگار واقعہ ہے۔ ان تمام معرکوں میں آزاد کشمیر کے مجاہدین نے ڈوگرہ فوج کے علاوہ ہندوستانی افواج ککے ساتھ بھی سر

For more books visit www.4Urdu.com

توڑ مقابلہ کیا۔ کیونکہ ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق ہوتے ہی بھارتی مسلح افواج نے بھی فوراً کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور اب بر سر عام مجاہدین آزادی کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئی تھیں۔

URDU4U.COM

پونچھ میں اپنی حکمرانی کی بساط الٹتے دیکھ کر مہاراجہ ہری سنگھ کو اب جہلم وادی کی فکر دامن گیر ہوئی' جس کی آبادی ۹۵ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیخ بھی تھے' مغل بھی اور پٹھان بھی۔ پٹھانوں میں ککی خیل آفریدیوں' یوسف زیٔوں اور مچھی پوریوں کا تناسب خاص طور پر نمایاں تھا۔ یہ لوگ پہلے پہل درانیوں کے ساتھ کشمیر آئے تھے اور بعد میں یہیں پر آباد ہو گئے تھے۔ البتہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ان کے اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ گہرے مراسم اور رشتہ داریاں بدستور قائم رہیں۔
مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں کی اس کثیر آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے سری نگر کے علاوہ وادی کے دوسرے اہم شہروں میں بھی ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے بڑے بڑے گروہ جمع کر رکھے تھے۔ جموں اور پونچھ کے واقعات کی خبریں سن سن کر وادی کے مسلمان بھی اپنے درندہ صفت حکمران کے عزائم سے بے خبر نہ تھے۔ جیسے جیسے مختلف مقامات پر ڈوگرہ فوج اور آر ایس ایس کے مظالم مسلم رعایا پر بڑھتے گئے' اسی رفتار سے مظفر آباد اور ٹیٹوال کے علاوہ وادی کے بہت سے باشندوں نے بھی اپنے بال بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کے سرحدی اور قبائلی علاقوں میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ریاست میں مسلمانوں پر جو قیامت برپا تھی' اس کا چرچا بھی عام ہو گیا۔ ڈوگروں کے مظالم کی دلدوز تفصیلات پھیلتے ہی پاکستان اور افغانستان کے قبائلی علاقوں میں غم اور غصے کی آگ لگ گئی اور پٹھان قبائلیوں کے لشکر اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کے لیے جوق در جوق ایبٹ آباد کی راہ سے بسوئے کشمیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

یہ قبائلی لشکر نہ کسی تنظیم میں منسلک تھے اور نہ ہی ان کی رہنمائی اور خبر گیری کے لیے کسی قسم کا ادارہ موجود تھا۔ جہاں کہیں سے وہ گزرتے تھے' عوام الناس حیرت انگیز کشادہ دلی سے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے' خوراک مہیا کرتے تھے اور جگہ جگہ ٹرک' تانگے اور بیل گاڑیاں مفت نذر کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پاپیادہ مارچ کرتے تھے' یا بسوں اور ریل گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے اور بعض بعض مقامات پر دریاؤں کو تیر کر یا بکری کی کھال کے بنے ہوئے مشکیزے کا سہارا لے کر عبور کر لیتے تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک ایبٹ آباد اور مظفر آباد کے درمیان بٹراسی کے جنگل میں ہزارہا محسودی' وزیری' آفریدی اور مہمند قبائلیوں کا ایک عظیم الشان لشکر جمع ہو گیا۔

وہاں پر اس لشکر کی نگہداشت مردان کے خان خوشدل خان نے بڑی محنت اور فیاضی سے کی' اور ہندوستانی فوج کے ایک ریٹائرڈ میجر خورشید انور نے اس لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس زمانے میں میجر خورشید انور پاکستان مسلم لیگ کی نیشنل گارڈ کے کمانڈر بھی تھے۔

ریاست کے اندر لوہار گلی اور رام کوٹ وغیرہ میں جو ڈوگرہ فوج متعین تھی' اس میں چند مسلمان افسر بھی موجود تھے۔ ان میں کیپٹن شیر خاں کا نام سر فہرست تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر میجر خورشید انور سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور مظفر آباد سمیت دریائے کرشن گنگا' دومیل اور کوہالہ کے پلوں کو صحیح سالم فتح کر کے اپنے قبضہ میں لینے کی حکمت عملی تیار کر لی۔ ریاستی فوج کے ایک ریٹائرڈ افسر میجر ایم اسلم خان' ایم سی بھی اس منصوبہ بندی میں شامل ہو گئے۔ وادی جہلم کے مقامی باشندوں نے بھی اندر ہی اندر اپنی صفوں کو منظم کرنا شروع کر لیا۔ "مجاہدین ہوم فرنٹ" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بھی قائم ہو گئی۔ بہت سے رضا کار گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کر کے ایک نیم فوجی تنظیم میں شامل ہو گئے جس کا نام حیدری کالم تھا۔ ثناء اللہ' محمد اقبال اور عبدالرشید نامی چند رضا کاروں نے کچھ خواتین کو اپنے ساتھ ملا کر سری نگر شہر میں کچھ اسلحہ تقسیم کرنے

For more books visit www.4Urdu.com

کی کوشش بھی کی۔ لیکن بد قسمتی سے ان میں سے کئی ایک گرفتار ہو کر جیل میں ڈال دیئے گئے۔

اس قسم کے ابتدائی اقدامات کسی حد تک مکمل ہو چکے' تو ۲۰ اکتوبر کی رات کو مجاہدین نے پیش قدمی شروع کی اور اگلے دو روز کے دوران ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے دستوں کو شکست دے کر کوہالہ' دومیل اور مظفر آباد کو فتح کر لیا۔ مظفر آباد سے آگے دس میل دور گڑھی دوپٹہ کے مقام پر ڈوگرہ فوج کو ایک اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اوڑی' بارہ مولا اور سری نگر تک راستہ صاف تھا۔ ۲۴ اکتوبر کو مجاہدین نے مہورہ پر قبضہ کر کے وہ پاور ہاؤس اڑا دیا جس سے سری نگر شہر کو بجلی فراہم ہوتی تھی۔ رات کے نو بجے جب اچانک سارا شہر گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا' اس وقت مہاراجہ ہری سنگ اپنے راج محل میں دسہرہ کا دربار لگائے بیٹھا تھا۔

مہورہ سے مجاہدین کا لشکر بارہ مولا پہنچا' تو دیکھا کہ ڈوگرہ فوج اور آر ایس ایس کے درندے اس شہر کو اپنے ہاتھوں تاخت و تاراج کر کے پہلے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سری نگر کی طرف مجاہدین کی یلغار کی خبر پا کر انہوں نے بے شمار نہتے اور معصوم مسلمان شہریوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ان کے گھر لوٹ کر نذر آتش کر دیئے تھے اور ایک عیسائی خانقاہ کے مکینوں اور اس کے ساتھ ملحق ہسپتال کے مریضوں تک کو اپنی بربریت کی سان پر چڑھانے سے گریز نہ کیا تھا۔ بارہ مولا کا شہر ملبے کا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ وہاں سے سری نگر فقط ۳۵ میل دور تھا۔ آگے کی جانب سڑک بالکل صاف تھی۔ دشمن کی طرف سے اب کسی مقام پر کسی قسم کی مزاحمت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مجاہدین کا لشکر فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا بارہ مولا تک آ پہنچا تھا۔ اب فقط چند گھنٹوں میں وہ آگے بڑھ کر سری نگر کے ہوائی اڈے کو قبضے میں لے کر اس مظلوم ریاست کے مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا بدل سکتا تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

URDU4U.COM

مہاراجہ کے دسہرہ دربار کے عین درمیان مہورہ کا بجلی گھر مجاہدین کے ہاتھوں شکستہ ہو کر جب سری نگر کا شہر تاریکی میں ڈوب گیا تو ڈوگرہ نسل کے ہندو راجپوت ہری سنگھ کو آناً فاناً اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنے محلات کا جس قدر بیش قیمت سامان وہ آٹھ دس ٹرکوں پر لاد سکتا تھا' انہیں ساتھ لے کر وہ راتوں رات بانہال روڈ کے راستے جموں کی طرف فرار ہو گیا۔ راستے میں جگہ جگہ رک کر اس نے اپنی ڈوگرہ رعایا کو خبردار کیا کہ راج ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ ریاست کی سر زمین پر مسلمانوں کی بغاوت کا سر کچلنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے پر کمر بستہ ہو جائیں۔ جموں کا شہر اور اس کے مضافات مسلمان آبادی سے یکسر خالی ہو چکے تھے۔ اس مکمل ہندو ماحول کے حصار میں پہنچتے ہی بھگوڑے مہاراجہ نے بھارت سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں سردار ولبھ بھائی پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا منظور نظر مسٹر وی پی مینن ہوائی جہاز سے پرواز کر کے جموں پہنچا اور بھارتی حکومت کی جانب سے مہاراجہ ہری سنگھ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے فوری طور پر اپنی ریاست کا ہندوستان سے الحاق نہ کیا تو اسے کسی قسم کی کوئی مدد نہ دی جائے گی۔ بزدل مہاراجہ نے بلا چوں و چراں گھٹنے ٹیک کر بھارت کے ساتھ الحاق کی درخواست پر دستخط کر دیئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جن الفاظ میں اس درخواست کا منظور کیا' وہ درج ذیل ہیں۔

My Dear Maharaja Sahib،

You Highness letter dated ۲۶ October has been delivered to me by Mr. V.P.Menon. In the special circumstances mentioned by Your Highness my Government has decided to accept the accession of Kashmir State to the Dominion of India. In consistence with their policy that in the case of any state، where the issue of accession has been the subject of dispute، the question of accession should be

For more books visit www.4Urdu.com

decided in accordance with the whishes of the people of the state, it is my Government's wish that as soon as law and order have been restored in Kashmir and her soil cleared of the invader, the question of the state's accession should be decided by a reference to the people.

Meanwhile, in response to Your Highness appeal for military aid, action has been taken today to send troops of the Indian Army to help your own forces to defend your territory and to protect the lives, property and honour of your people.

My Government and I note with satisfaction that Your Highness has decided to invite Sheikh Abdullah to form an interim Government to work with your Prime Minister.

I remain

Your sincerely,

Mountbatten of Burma

New Delhi,

[illegible] October, [illegible]

مندرجہ بالا خط پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دستخط کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی روز صبح نو بجے سے بھارتی ہوائی جہازوں نے ہندوستانی فوج کے دستے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتارنا شروع کر دیئے۔ ایک ایک دن میں پچاس پچاس پروازیں یہ فرض ادا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی گرداسپور کے راستے بھارتی فوج کی کثیر تعداد نے بھی صوبہ جموں میں مارچ کرنا شروع کر دیا۔ بھارت نے یہ جنگی تیاریاں پہلے ہی سے مکمل کر رکھی تھیں۔ الحاق کے متعلق مہاراجہ کی درخواست محض ایک بہانہ تھی۔ اس بہانہ کے ہاتھ آتے ہی بھارت نے اپنے جارحانہ عزائم پر فی الفور عملدرآمد شروع کر دیا۔

سری نگر کے ہوائی اڈے پر بھارتی افواج' اسلحہ اور ٹینک انڈین ایئر فورس کے جہازوں سے برآمد ہوتے ہی آزادی کشمیر کی جنگ کا پانسہ اچانک پلٹ گیا۔ مجاہدین کے لشکر کا زیادہ حصہ دو روز سے خواہ مخواہ بارہ مولا میں اٹکا ہوا تھا۔ اگر اس لشکر کا تھوڑا سا حصہ بھی یلغار کر کے سری نگر ایئر پورٹ پر قابض ہو جاتا تو بھارتی فوج وادی کشمیر پر تسلط جمانے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس مجاہدین کی

For more books visit www.4Urdu.com

ہمت ٹوٹ گئی' ان میں ایک طرح کی بھگدڑ مچ گئی اور وہ انتہائی غیر منظم طور پر اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس لوٹنا شروع ہو گئے۔ یہ صورت حال کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا کوئی حتمی جواب مجھے نہیں مل سکا۔ اس بارے میں طرح طرح کے مفروضے' امکانات اور قیاس آرائیاں سننے میں آتی ہیں۔

URDU4U.COM

ایک نظریہ تو یہ مشہور ہے کہ لشکر کے کمانڈر میجر خورشید انور نے مجاہدین کو بارہ مولا میں اس وجہ سے روکے رکھا کہ سری نگر پہنچنے سے پہلے وہ کشمیر کے سیاسی مستقبل میں اپنی ذاتی پوزیشن کو صاف طور پر متعین اور مستحکم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے سری نگر کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی معرض التوا میں پڑی رہی۔
دوسرا گمان یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کی نیشنل پارٹی کے ایجنٹوں کے علاوہ ہندوستان کے چھوڑے ہوئے بہت سے جاسوس بھی ففتھ کالم کا لبادہ اوڑھ کر حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے طرح طرح کے نفسیاتی حربوں سے کام لے کر مجاہدین کی صفوں میں اس قسم کی افواہیں پھیلا دیں کہ ہندوستان کی منظم فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان جنگ میں اتر آئی ہے۔ ہندوستان کے بمبار اور لڑاکا طیارے بھی مجاہدین کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے پر تول رہے ہیں اور ان کی پسپائی کے راستے بھی رفتہ رفتہ بھارتی فوج کے قبضے میں آتے جا رہے ہیں۔ قبائل لشکر دست بدست گوریلا جنگ لڑنے کے غازی تو ضرور تھے۔ لیکن ففتھ کالم کے ساتھ اس طرح کی نفسیاتی جنگ میں مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں وہ بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔
تیسرا قیاس یہ ہے کہ مقبول شیروانی نام کے ایک نیشنل کانفرنسی سیاست دان نے مجاہدین کے ایک لشکر کی بارہ مولا تک رہنمائی کرنے کے بہانے اسے ایسے طویل اور پیچیدہ راستوں پر ڈال دیا کہ وہ دو روز تک غلط اور دشوار گزار گھاٹیوں میں ہی بھٹکتے رہے۔ باقیماندہ لشکر بارہ مولا میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس طرح سری نگر کی جانب بڑھنے کا

For more books visit www.4Urdu.com

انتہائی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ بارہ مولا پہنچ کر جب مقبول شیروانی کی غداری کا راز فاش ہوا تو مجاہدین نے اسے وہیں پر تہ تیغ کر ڈالا۔

URDU4U.COM

چوتھی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بھارتی ففتھ کالم کے علاوہ قادیانیوں کے ایک منظم گروہ نے بھی اس موقعہ پر مسلمانوں کے ساتھ غداری کو عملی جامہ پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اصلی آزاد کشمیر گورنمنٹ تو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز قائم ہوئی تھی۔ لیکن پونچھ میں جہاد کا رنگ اور رخ بھانپ کر غلام نبی گلکار نامی ایک کشمیری قادیانی نے بیس روز قبل ہی ۴ اکتوب کو اپنی صدارت میں آزاد جمہوریہ کشمیر کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ غالباً یہ اعلان راولپنڈی صدر کے ایک ہوٹل "ڈان" میں بیٹھ کر کیا گیا تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مسٹر گلکار نے اپنی تیرہ رکنی کابینہ بھی منتخب کر لی تھی' جو زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کا تعلق قادیانی مذہب سے تھا۔ اس اعلان کے دو روز بعد ۶ اکتوبر کو گلکار مظفر آباد کی راہ سے سری نگر میں اس کی حرکات و سکنات عام طور پر پردہ راز میں ہیں لیکن باور کیا جاتا ہے کہ بارہ مولا سے سری نگر کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی سے قادیانیوں کے اپنے منصوبے خاک میں مل گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ جنت ارضی بلا شرکت غیرے قادیانیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ پاکستان جانے والی ہے تو انہوں نے بھی ففتھ کالم کا روپ دھار کر اس امکان کو ملیا میٹ کر دیا۔

میرے خیال میں یہ سب اندازے اور قیاس آرایاں اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی حد تک حقائق پر مبنی ہیں۔ کشمیر کے محاذ سے مجاہدین کی غیر متوقع' بے محل اور بے وقت پسپائی ان سب وجوہات کا اجتماعی نتیجہ تھی۔

جس مجرمانہ مکاری' دغا' فریب اور سازشانہ جارحیت کے ذریعے بھارت نے کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا' اس کی حقیقت ساری دنیا پر اظہر من الشمس تھی۔ اپنی اپنی گھناؤنی کاروائیوں

For more books visit www.4Urdu.com

پر پردہ ڈالنے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے بین الاقوامی سطح پر بہانگ دہل رٹ لگانی شروع کر دی کہ بھارت فیصلہ جموں و کشمیر کے باشندوں کی آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری (Plebiscite) کے ذریعہ کروایا جائے گا۔

URDU4U.COM

بھارتی وزیراعظم کے اس نوعیت کے بے شمار اعلانات کے انبار میں سے میں نے یہاں پر صرف چند ایک کا انتخاب کر کے درج کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے ایک بیان پر ایک اعلان بھی سچائی' خلوص' دیانتداری اور نیک نیتی پر مبنی نہ تھا۔ یہ ساری لفاظی پر فریب وعدوں کی نمائش تھی جس کے ذریعہ اقوام عالم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ راج نیتی میں پنڈت جی اپنے مہا گرو چانکیہ کے نہایت کامیاب چیلے تھے۔ ایک طرف وہ سلامتی کونسل کی بنیادی قرار دادوں کو برضا و رغبت قبول کئے بیٹھے تھے جن کی رو سے انہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ کشمیر سے فریقین کی مسلح افواج کے انخلاء کے بعد الحاق کا مسئلہ ایک آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ طے ہو گا' جس کا بندوبست یو این او کا متعین کردہ کرے گا۔ لیکن دوسری جانب جنگ بندی کے فوراً بھارت کی حکومت نے ان قرار دادوں پر عملدرآمد میں طرح طرح کے روڑے اٹکانا شروع کر دیئے تھے۔ جوں جوں کشمیر پر بھارت کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا' اسی رفتار سے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی وعدہ خلافیوں' بے وفائیوں اور فریب کاریوں کا راز بھی طشت از بام ہوتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں پنڈت جی کی قلابازیاں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ محض نمونہ کے طور پر ان کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں یو این او کے کمیشن (U.N.C.I.P.) نے ایک میٹنگ اس غرض سے منعقد کی کہ سلامتی کونسل کی قرار داد کے مطابق پاکستانی اور بھارتی افواج کو کشمیر سے واپس بلانے کا پروگرام طے کیا جائے۔ پاکستان نے اپنا پروگرام پیش کر دیا۔ ہندوستان ٹال

For more books visit www.4Urdu.com

متوّل کر کے اپنی فوجیں ریاست کی حدود سے باہر نکالنے سے مکر گیا۔
اسی برس اگست میں یو این او کے کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر سے مسلح افواج
URDU4U .COM
کے انخلاء کا فیصلہ ایک ثالث کے ذریعہ طے کروا لیا جائے۔ ایڈمرل نمٹز (Admiral Nimitz) استصواب رائے کے ناظم (Plebiscite Administrator) نامزد ہو چکے تھے۔ کمیشن کی تجویز تھی کہ ثالثی کا فریضہ بھی انہی کو سونپ دیا جائے۔ یہ تجویز اتنی معقول تھی کہ امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیراعظم اٹیلی نے بھی اعلانیہ طور پر سفارش کی کہ دونوں فریق اسے مان لیں۔ پاکستان نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔
اس ناکامی کے بعد سلامتی کونسل نے اپنے اس ماہ کے صدر (دسمبر ۱۹۴۹ء) کو یہ اختیار دیا کہ وہ فریقین کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ موجودہ بحران کا کوئی حل نکالیں۔
ان کا اسم گرامی جنرل میکناٹن تھا اور وہ کینیڈا کے رہنے والے تھے۔ کافی افہام و تفہیم اور سوچ و بچار کے بعد انہوں نے کچھ تجاویز مرتب کیں۔ پاکستان نے ان تجاویز کو قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے مین میخ نکال کر ان میں ترامیم کی ایسی بھرمار کی کہ وہ عملی طور پر مسترد ہو کر رہ گئیں۔
جنرل میکناٹن کے بعد سلامتی کونسل نے سر اوون ڈکسن کو اسی مقصد کے لیے میدان عمل میں اتارا۔ انہوں نے بھی حالات کا پورا پورا جائزہ لے کر بہت سی تجاویز پیش کیں۔ پاکستان حسب معمول مان گیا' لیکن بھارت بدستور اپنی ضد پر اڑا رہا۔
اب سر اوون ڈکسن کی جگہ ڈاکٹر فرینک پی گراہم نے سنبھالی۔ سلامتی کونسل نے ایک بار پھر اپیل کی کہ استصواب رائے کی راہ ہموار کرنے کے لیے متنازعہ امور پر دونوں فریق ثالثی فیصلہ قبول کر لیں۔ بین الاقوامی انصاف کی عدالت کا صدر ثالثوں کو مقرر کرنے کا مجاز ہو گا۔ پاکستان نے سلامتی کونسل کی یہ تجویز منظور کر لی۔ بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ڈاکٹر گراہم نے ہر طرح کے ممکنہ فارمولوں کی بنیاد پر سلامتی کونسل کو چھ رپورٹیں پیش کیں۔ اس کے تقریباً ہر فارمولا کو پاکستان منظور اور بھارت نامنظور کرتا رہا۔ ڈاکٹر گراہم کی پہلی رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ ان کو سلامتی کونسل کی تائید بھی حاصل تھی۔ اسی لیے کونسل نے ان تجاویز کو ایک قرار داد کی صورت میں بھی منظور کر لیا تھا۔ یہ قرار داد ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو منظور ہوئی تھی' لیکن بھارت نے اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم کی پانچویں رپورٹ کے بعد سلامتی کونسل نے اپنے صدر اور سویڈن کے سفیر گنار یارنگ کو اختیار دیا کہ وہ اس تعطل میں دخل دے کر اسے توڑنے کی کوشش کریں۔ ہندوستان کی نازک مزاجی کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ثالثی کا لفظ استعمال کئے بغیر اسی کے لگ بھگ چند نہایت معقول تجاویز پیش کیں۔ پاکستان نے انہیں تسلیم کر لیا' لیکن بھارت نے نامنظور کر دیا۔

اس ناکامی کے بعد دسمبر ۱۹۵۷ء میں سلامتی کونسل نے دوبارہ ڈاکٹر فرینک گراہم کو اپنا مشن سنبھالنے کی پیش کش کی۔ اس بار انہوں نے پانچ نکات پر مبنی ایک نہایت منصفانہ' معتدل اور واجبی تجویز مرتب کی۔ پاکستان نے اس کے پانچوں نکات کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم نے اپنی آخری اور چھٹی رپورٹ ۱۹۵۸ء میں پیش کی تھی لیکن اس پر غور کرنے کے لیے سلامتی کونسل کو چار برس بعد اپریل ۱۹۶۲ء میں فرصت ملی۔ غالباً اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر کشمیر کا معاملہ کافی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ چنانچہ سلامتی کونسل میں کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ کئے بغیر آئر لینڈ کی جانب سے ایک نہایت ہلکی اور دھیمی سی قرار داد پاس ہوئی جس میں فریقین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلامتی کونسل کی سابقہ قرار دادوں کی روشنی میں باہمی افہام و تفہیم سے اس قضئے کو نپٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ لیکن یہ کمزور اور بے اثر سی قرار داد بھی کسی کام نہ آ سکی کیونکہ

For more books visit www.4Urdu.com

سوویت روس نے اسے ویٹو کر دیا۔ یوں بھی ابتدا ہی سے سوویت یونین نے کشمیر کے بارے میں کسی قرار داد پر نفی یا اثبات میں ووٹ ڈالنے سے ہمیشہ احتراز برتا تھا۔

URDU4U.COM

۱۹۶۵ء تک پچھلے ۱۸ سال کے دوران سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ ۱۳۳ بار زیر بحث آ چکا ہے۔ کبھی بھارت کی درخواست پر' کبھی پاکستان کی تحریک پر۔ اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ یہ مسئلہ بھارت کا اندرونی معاملہ ہے؟ سوویت یونین جیسی ایک عظیم سپر پاور اس مسئلہ کو بھارت کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا نام دے کر اپنا ویٹو استعمال کرنے پر اپنے ضمیر کو کس طرح آمادہ کر سکتی ہے؟ ان پریشان کن اور حیران کن سوالات کے جواب چانکیہ اور کوٹلیہ کے شاستروں میں ہوں تو ہوں لیکن مہذب اور شائستہ اقوام کی تواریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکیں گے۔

سلامتی کونسل کی بین الاقوامی اسٹیج پر بھارت نے جو ڈرامہ رچا رکھا تھا' اس کی کچھ جھلکیاں تو مختصراً بیان ہو چکیں۔ لیکن خود مقبوضہ کشمیر کے اندر جو ناٹک کھیلا جا رہا تھا اس کی داستان الگ ہے۔ اس المیے میں شیخ عبداللہ کا اپنا کردار بھی گرگٹ کی طرح بار بار رنگ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ جب پہلے پہل بین الاقوامی سطح پر اٹھایا گیا تھا تو بھارتی وفد کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی یو این او گئے تھے۔ پاکستان وفد کے ہمراہ چند ایسے افراد بھی تھے جن کے شیخ صاحب کے ساتھ کسی قدر دیرینہ اور گہرے تعلقات تھے۔ ان میں سے کسی نے شیخ صاحب کو پاکستان کے موقف کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی' تو وہ طیش میں آ گئے اور انتہائی غرور اور تکبر سے بولے۔ "بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق قطعی اور اٹل ہے۔ اب تو خدا بھی خود آ کر اسے توڑنا چاہے' تو یہ نہیں ٹوٹ سکتا۔" (نعوذ باللہ)

یہ قصہ مجھے ابوالاثر حفیظ جالندھری نے سنایا تھا' جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔

اپنے اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کے زر خرید

For more books visit www.4Urdu.com

غلام کا روپ دھار کر طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں بھارت نے اپنے آئین میں ایسی ترامیم کر ڈالیں جس کی رو سے ہندوستان کو مقبوضہ کشمیر میں بھی اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ پاکستان کے طوطی نے حسب توفیق یو این او کے نقار خانے میں اپنی آواز اٹھائی' لیکن بے سود۔

اس اقدام کے ایک برس بعد بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی کا سوانگ رچا کر اس سے ریاست کے الحاق پر تصدیق کا انگوٹھا لگوانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس اسمبلی کی حیثیت کے بارے میں سلامتی کونسل نے ایک قرار داد کے ذریعہ پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اسے ریاست کے الحاق کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ فیصلہ لازمی طور پر انہی قرار دادوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے جنہیں یو این او بھارت اور پاکستان کی منظوری حاصل ہے۔ اس موقع پر سلامتی کونسل میں بھارتی نمائندہ نے بر سر عام اور کھلے بندوں بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ یقین دہانی کرائی کہ مقبوضہ کشمیر میں قائم ہونے والی آئین ساز اسمبلی کا ان معاملات سے ہرگز کوئی واسطہ نہ ہو گا جن کا فیصلہ سلامتی کونسل کے دائرہ اختیار میں ہے۔ بھارتی نمائندہ نے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ یہ اسمبلی الحاق کے مسئلہ پر اظہار رائے تو کر سکے گی لیکن اسے کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا بالکل کوئی اختیار نہ ہو گا۔ اس وعدہ وعید کے بعد مقبوضہ کشمیر میں اس نام نہاد آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے' جو سراسر چالبازی' دھاندلی اور فریب کا دھندہ تھے۔ ان کے نتیجہ میں شیخ عبداللہ کی جماعت نے تمام کی تمام ۷۵ نشستیں بلا مقابلہ جیت لیں۔ انتخابات کے تقریباً دس ماہ بعد جولائی ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے اس منحوس اور شرمناک دستاویز پر دستخط کر دیئے جو "معائدہ دہلی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے ریاست کا پورا وجود مکمل طور پر بھارتی حکومت کے زیر نگیں آ گیا۔ ایک سو چھ برس قبل انگریزوں نے اس بہشت ارضی کو "معاہدہ امرتسر" کے ذریعہ مبلغ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت

For more books visit www.4Urdu.com

کر ڈالا تھا۔ اب ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے "معاہدہ دہلی" کے نام پر اس سر زمین کو پنڈت جواہر لال نہرو کے قدموں میں فقط اپنی کرسی کے عوض ڈال دیا۔ پنڈت جی کو یہ سودا راس آس آیا' کیونکہ ایک سال اور ایک ماہ کے اندر اندر انہوں نے شیخ صاحب کو کرسی اقتدار سے اٹھا کر منہ کے بل نیچے دے مارا اور لگے ہاتھوں گھسیٹ کر جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا فوجی قبضہ استبداد تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن "معاہدہ دہلی" کے وجود میں آتے ہی ہندوستان کو ریاست کے تمام امور میں دخل اندازی کا بزعم خود آئینی اور قانونی جواز بھی پیدا ہو گیا۔ بھگوڑا مہاراجہ ہری سنگھ عرصہ دراز سے امور ریاست سے کنارہ کش ہو کر جلا وطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اب ڈوگرہ راج کی موروثی گدی کو موقوف کر کے مہاراجہ کے ۳۵ سالہ بیٹے کرن سنگھ کو ریاست کے آئینی سربراہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ اس پر ریاست کے طول و عرض میں ہندو آبادی میں شدید رد عمل رونما ہوا اور جگہ جگہ شیخ عبداللہ کے خلاف مظاہروں کا تانتا لگ گیا۔ ریاست بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بھی زور پکڑ گئی۔ اب شیخ صاحب کی آنکھیں کھلیں اور انہیں ہندوؤں کے ساتھ اپنی وفاداری کا نوشتہ دیوار صاف طور پر ظاہر ہو کر سامنے نظر آنے لگا۔ مایوسی کے عالم میں بوکھلا کر انہوں نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور اپنی تقریروں میں بھارت کے خلاف گلے شکوے کے علاوہ کشمیر کی خود مختاری اور آزادی کا راگ بھی الاپنا شروع کر دیا۔ ان کے اس رویے میں بھارت کو کشمیر کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کو بو آنے لگی۔

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی اشیر باد حاصل کرنے کے بعد کرن سنگھ نے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے روز شیخ عبداللہ کو معزول کر کے جیل بھیج دیا۔

شیخ صاحب کی جگہ بخشی غلام محمد مقبوضہ کشمیر کے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان فرمایا کہ پاکستان جس استصواب رائے کے خواب دیکھ رہا

For more books visit www.4Urdu.com

ہے' کشمیر میں رائے شماری کا وہ دن کبھی طلوع نہ ہو گا۔ پانچ ماہ بعد فروری ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور کشمیر کی نام نہاد اسمبلی نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق کر دی۔ اسی کے ساتھ بھارت نے بھی اپنا پورے کا پورا آئین مقبوضہ کشمیر پر مسلط کر دیا اور یوں پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ بن گیا۔

پاکستان نے ان اقدامات کے خلاف بھارت سے احتجاج کیا تو پنڈت نہرو اپنی عادت کے مطابق بگلا بھگت بن کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ "یو این او" کی قرار دادوں کے مطابق بھارت کشمیر میں استصواب رائے کا وعدہ نبھانے کا سختی سے پابند ہے۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کی اس سے زیادہ واضح مثال چراغ لے کر ڈھونڈنے سے ملنا بھی محال ہے۔ کشمیر کے حوالے سے پنڈت جی کی ایسی بہت سی قلابازیوں کا تذکرہ بھی اس کتاب کے ایک دوسرے باب "صدر ایوب اور پاکستان کی خارجہ پالیسی" میں "بھارت" کے ذیلی عنوان کے تحت کئی جگہ آتا ہے۔

اردو زبان کا ایک فصیح و بلیغ محاورہ ہے۔ "نہ رہے نہ بجے بانسری" ------- اگر آزادی کا بانس شروع ہی میں پوری طرح کشمیریوں کے ہاتھ آ جاتا' تو یقیناً پنڈت جواہر لال نہرو سلامتی کونسل' مقبوضہ کشمیر اور پاکستان کے اسٹیج پر اپنی منافقانہ ہٹ دھرمی اور دوغلی پالیسیوں کی بنسری بجانے سے محروم رہتے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جب مجاہدین کا لشکر مظفر آباد کے راستے سری نگر کی جانب روانہ ہوا تھا' اس کے ساتھ ہی بیک وقت سوچیت گڑھ کی طرف سے جموں کی طرف بھی چڑھائی کر دی جاتی۔ اٹھارہ بیس میل کا یہ میدانی فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر کے جموں کا شہر اور وسیع علاقہ باآسانی فتح کیا جا سکتا تھا۔ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ اور خواجہ دین وانی کے علاوہ پروفیسر محمد اسحاق قریشی اور چوہدری غلام عباس کے بھائی محمد زبیر صاحب نے

For more books visit www.4Urdu.com

یکے بعد دیگرے لاہور اور کراچی میں زعمائے پاکستان کی توجہ اس حکمت عملی کو آزمانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کسی وجہ سے کسی صاحب اقتدار شخص نے ان کی

URDU4U.COM

تجاویز پر عمل کرنے کی حامی نہ بھری۔

اس کے علاوہ کشمیر کو مکمل طور پر آزاد کروانے کا ایک اور موقع بھی آیا تھا' جو ہاتھ سے نکل گیا۔

بھارتی افواج تو کشمیر میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح سے داخل ہونا شروع ہوئی تھیں لیکن ہمارے جی ایچ کیو کو ان کے اس ادارے کی خبر ایک رات قبل ہی مل چکی تھی۔ یہ اس طرح کہ لاہور ایریا ہیڈ کوارٹر نے بھارتی پیرا شوٹ بریگیڈ کا ایک خفیہ پیغام راستے ہی میں پکڑ کر اس کے رموز پڑھ لیے تھے اور اسے فوراً اپنے جی ایچ کیو تک پہنچا دیا تھا۔ اس روز قائداعظم لاہور میں موجود تھے' لیکن کسی نامعلوم وجہ سے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے حملے کی خبر انہیں اسی روز شام کے وقت سنائی گئی۔

فوری رد عمل کے طور پر قائداعظم نے پاکستان کی بری افواج کے قائمقام کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی کو حکم دیا کہ پاکستانی افواج کو بھی بلا تاخیر کشمیر میں بھیج دیا جائے۔ جنرل گریسی نے بست و لعل کر کے اس حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے نئی دہلی میں فیلڈ مارشل سر کلاڈ اوکنلیک کو مطلع کر دیا' جو اگلی صبح بنفس نفیس لاہور تشریف لے آئے۔ اوکنلیک نے دھمکی دی کہ قائداعظم کی ہدایات پر عمل کرنے کی صورت میں افواج پاکستان کے تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ فوج کا تمام تر ڈھانچہ غیر منظم ہو جائے گا۔

اس کے بعد قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دعوت دی کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو' مہاراجہ کشمیر اور کشمیر کے وزیراعظم کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئیں تا کہ ۲۹ اکتوبر کو ایک میٹنگ میں بالمشافہ گفت و شنید کے ذریعہ اس سنگین صورت حال کا حل تلاش کیا جائے۔ دعوت تو منظور کر لی گئی۔ لیکن مقررہ تاریخ پر پنڈت جی حقیقتاً یا مصلحتاً بیمار پڑ

For more books visit www.4Urdu.com

گئے۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن یکم نومبر کو اکیلے لاہور تشریف لائے۔ قائداعظم نے اس کے سامنے کئی معقول مصالحتی تجاویز پیش کیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ٹال مٹول کر کے دامن بچاتے رہے کہ وہ محض آئینی گورنر جنرل ہیں۔ دہلی واپس جا کر وہ یہ تجاویز بھارتی حکومت کے سامنے رکھیں گے اور پھر ان کے فیصلے سے قائداعظم کو آگاہ کریں گے۔ دہلی جا کر ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو خود تو کوئی جواب نہ بھیجا' لیکن اگلے روز وزیراعظم نہرو نے آل انڈیا ریڈیو سے کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے خلاف ایک نہایت تند و تیز اور تلخ تقریر نشر کر ڈالی۔ جس سے بھارت کے اصلی عزائم طشت از بام ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن' بھارت کے ان عزائم میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔

آزاد جموں و کشمیر حکومت جو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے قائم ہے' ریاست کے تقریباً ایک تہائی حصے کو کنٹرول کرتی ہے۔ گلگت اور اسکردو سمیت ریاست کے شمالی علاقے حکومت پاکستان کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔ وفاقی وزارت امور کشمیر حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتی ہے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر حکومت کے قیام کی خبر سنتے ہی میں فوراً چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے فوراً تراڑ کھیل روانہ ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے تا کہ میں اس نئی حکومت کی کوئی خدمت بجا لا سکوں۔ انہوں نے فرمایا کہ کشمیر کی جنگ آزادی میں پاکستان کی حکومت کسی طرح بھی ملوث ہونے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔ تم پاکستان کی ایک اہم سروس کے سرکاری ملازم ہو اس لیے تم آزاد کشمیر نہیں جا سکتے۔

میں نے گذارش کی کہ آپ میرا استعفیٰ لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اگر کسی وقت آزاد کشمیر میں میری موجودگی پاکستان کے لیے کسی الجھن یا پریشانی کا باعث بنے تو آپ بے شک میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے اپنی ملازمت سے دستبردار سمجھ لیں۔ چودھری صاحب

For more books visit www.4Urdu.com

مسکرائے اور بولے۔ "جذباتی نہ بنو' پاکستان بھی صرف دو ڈھائی ماہ پہلے وجود میں آیا ہے' یہاں پر بھی خدمت کی بہت گنجائش ہے۔"

URDU4U.COM

میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ کام تو میں وزارت تجارت میں انڈر سیکرٹری کے طور پر کرتا رہا لیکن دل بدستور آزاد کشمیر میں اٹکا رہا۔ پھر مارچ ۱۹۴۸ء میں اچانک چوہدری غلام عباس مقبوضہ کشمیر سے رہا ہو کر پاکستان آ گئے۔ آتے ہی وہ فوراً قائداعظم کی خدمت میں حاضر دینے کراچی آئے اور ہمارے ہاں فروکش ہوئے۔ اگلے روز قائداعظم نے انہیں لنچ پر مدعو فرمایا۔ جس وقت ہم انہیں ایک نہایت ناقابل اعتبار اور پھٹیچر سی کار پر گورنر جنرل ہاؤس چھوڑنے جا رہے تھے تو راستے میں ان کو میں نے آزاد کشمیر کے متعلق اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا کیا کارروائی کہاں کہاں پر ہوئی البتہ کچھ عرصہ بعد چوہدری محمد علی صاحب نے ایک روز مجھے اپنے دفتر میں بلا کر یہ مژدہ سنایا کہ تمہیں آزاد کشمیر حکومت میں جا کر کام کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن تمہاری موجودہ تنخواہ تمہیں وزارت تجارت ہی سے ملا کرے گی۔ کیونکہ سرکاری گزٹ میں تمہارا نام اسی وزارت کے ملازمین کی فہرست میں شامل رہے گا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں جا کر میرا کام کیا ہو گا۔ چودھری صاحب نے فرمایا۔ "وہاں پر کابینہ بن چکی ہے' اس کے ماتحت نظم و نسق کا سارا کام تمہیں سنبھالنا پڑے گا۔"

چلتے چلتے چوہدری محمد علی نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ "تم نوجوان اور نو آموز ہو۔ کام نیا اور مشکل ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ اگر کبھی کسی معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئے تو میرے ساتھ رابطہ قائم کرنے سے ہرگز نہ ہچکچانا۔"

پاکستان کے سیکرٹری جنرل کی اس خیر سگالی کو پلے باندھ کر میں نے خوشی خوشی رخت سفر باندھا اور آزاد کشمیر کی راہ لی۔ اس زمانے میں کوہٹہ سے آزاد پتن ہوتے ہوئے پلندری اور تراڑ کھیل تک انتہائی تنگ اور بالکل کچی سڑک تھی۔ کسی کسی موڑ پر تو گاڑی کا اگلا ایک پہیہ سڑک سے نکل کر کھڈ کی جانب معلق ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر

For more books visit www.4Urdu.com

بارش کے دنوں میں اس قدر پھسلن ہوتی تھی کہ جیپوں اور ٹرکوں وغیرہ کے پھسل کر گہری کھڈ میں گرنے کے حادثات آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔ میں بھی ایک روز جیپ میں سوار ہو کر شدید بارش میں پھسلتا اور ہچکولے کھاتا حکومت آزاد کشمیر کے صدر مقام پہنچ گیا' جو پلندری اور تراڑ کھیل کے درمیان جنجال ہل نامی ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر ڈھائی تین درجن چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ چند مکانوں میں حکومت کے دفاتر تھے۔ باقی گھر صدر' وزراء اور دیگر سرکاری ملازمین کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہاں پر مجھے بھی ایک کمرے پر مشتمل ایک کچا کوٹھا مل گیا' جس کے ایک کونے میں باورچی خانے کے طور پر مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔

جنجال ہل ایک نہایت ہی پر فضا مقام تھا اور طرح طرح کے سرسبز درختوں کے گھنے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ آس پاس ایک دو پہاڑی جھرنے تھے' جن کی ہلکی ہلکی' مدھم مدھم سی موسیقی دن رات اپنی تانیں اڑاتی رہتی تھی۔ دفتروں کے کمرے روایتی ساز و سامان سے بڑی حد تک محروم تھے۔ فائلوں کے لیے نہ زیادہ الماریاں تھیں نہ شیلف۔ عام طور پر پتھر کی سلوں کو ہموار رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دفتری کام کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ دن بھر بھارت کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے یا دائیں بائیں پرواز کرتے ہوئے گزرتے رہتے تھے اور اپنے نشانوں پر اندھا دھند بم برسا کر خراماں خراماں واپس لوٹ جاتے تھے' ہماری جانب سے ان کی مزاحمت یا روک تھام کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ کئی بار بھارتی طیاروں کی اڑان اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ ہمیں پائلٹوں کے منہ اور سر تک صاف نظر آ جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا سہارا صرف اللہ پر توکل تھا۔ جب کبھی کوئی بھارتی طیارہ آس پاس بم برساتا یا مشین گن سے بے تحاشا گولہ باری کرتا عین ہمارے اوپر سے گزرتا تھا تو ہم دم سادھ کر اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھ جاتے تھے تا کہ ہماری نقل و حرکت سے ہوا باز ہماری چھوٹی سی آبادی کا سراغ نہ پا لیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

ایک روز آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس اور صدر سردار ابراہیم پلندری کے قریب ایک مقام پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ عین اس وقت بھارتی ایئر فورس کا ایک بمبار طیارہ ان کے اوپر آ گیا۔ بیسیوں جانثاروں نے اپنے دونوں لیڈروں کے اوپر اپنے اجسام کا ایسا حفاظتی حصار بنا لیا گیا کہ گولہ باری کی صورت میں ان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ باقی ہزاروں سامعین بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ہندوستانی طیارہ کچھ عرصہ آس پاس منڈلایا اور غالباً جلسہ گاہ میں زندگی کے کوئی آثار نہ پا کر کوئی بم یا گولیاں برسائے بغیر آگے بڑھ گیا۔

بھارتی ایئر فورس کا ایک خصوصی ہدف دومیل (مظفر آباد) میں دریائے جہلم اور دریائے نیلم (سابق کرش گنگا) کے پل تھے' جو فوجی نکتہ نظر سے اس علاقے میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شروع شروع میں خوش عقیدہ مقامی مسلمانوں نے ان پلوں کی حفاظت کے لیے ان کے دونوں سروں پر قرآن حکیم کا ایک ایک نسخہ بطور تعویذ باندھ رکھا تھا۔ بھارتی بمباروں نے ان پلوں کو نشانہ بنانے کے لیے سینکڑوں حملے کئے لیکن ان کا ایک بھی نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ کچھ عرصہ بعد جب پاکستانی فوج کو مجبوراً اس جنگ کے محاذ پر آنا پڑا تو ان پلوں کی حفاظت کے لیے ایک طیارہ شکن توپ بھی وہاں پر نصب ہو گئی۔

اس بندوبست سے مطمئن ہو کر لوگوں نے پلوں پر باندھے ہوئے قرآن شریف احتراماً اتار کر رکھ لیے۔ کچھ روز بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھارتی بمباروں کے حملے میں ایک بم سیدھا ایک پل پر آ کے لگا اور پھٹے بغیر سوراخ کر کے نیچے دریا میں جا گرا۔ یہ بھی اللہ تعالٰی کی قدرت ت ھی کہ پل میں ایک معمولی سا سوراخ ہونے کے علاوہ اس بم سے اور کوئی نقصان نہ پہنچا۔

جنجال ہل میں سول حکومت کے سب کارندے بھی اپنی اپنی جگہ جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ سردار محمد ابراہیم کی صدارت میں کابینہ کے تمام اراکین بے حد فعال' خوش خصال اور دیانتدار تھے۔ سید علی احمد شاہ وزیر دفاع نہایت نیک سیرت اور پابند صوم و صلوٰہ بزرگ تھے۔ انہیں ثقل سماعت کا عارضہ تھے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ خود بھی ضرورت سے زیادہ

For more books visit www.4Urdu.com

بلند آواز میں بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ عام طور پر وہ دوسروں کی بہت کم سنتے اور اپنی بہت زیادہ سنانے کے شوقین تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا بھونپو نما آلہ سماعت ہوتا تھا۔ اگر کبھی وہ کسی اور کی کوئی بات سننے کا ارادہ کرتے تو اس آلہ کو کان سے لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ورنہ عام طور پر وہ اسے جیب میں ڈال کر یکطرفہ گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ دفتری قواعد و ضوابط پر انہیں خوبصورت مہارت حاصل تھی اور دساتیر عالم کا مطالعہ کرنے کا بھی انہیں خاص شوق تھا۔ کشمیر کے آئینی مستقبل کا تانا بانا اپنے ذہن میں بنتے رہنا ان کا دلپسند مشغلہ تھا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ تک آزاد کشمیر کے صدر بھی رہے۔

وزیر خزانہ سید نذیر حسین شاہ بڑے نیک مزاج' رحمدل اور نرم گفتار انسان تھے۔ جنگ کی وجہ سے خزانہ خالی تھا۔ لیکن سرکاری چیک بک ہمیشہ شاہ صاحب کی جیب میں موجود رہتی تھی۔ جہاں کہیں کوئی ضرورت مند کچھ امداد یا کوئی محکمانہ اخراجات کے لیے کچھ رقم طلب کرتا' وہ وہیں پر کھڑے کھڑے چیک کاٹ کر ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں نہ تو ابھی تک کوئی بجٹ بنانے کی نوبت آئی تھی اور نہ ہی آمدنی اور خرچ پر محکمہ فنانس اور محکمہ اکاؤنٹنٹ جنرل کا روایتی کنٹرول تھا۔ آزاد کشمیر کا نظم و نسق سنبھالتے ہی جب میں نے پہلے پہل بجٹ تیار کر کے محکمہ فنانس اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے سرخ فیتے کا نظام رائج کیا اور شاہ صاحب سے سرکاری خزانے کی چیک بک واپس لے لی تو وہ بڑے حیران اور غالباً کسی قدر آزردہ سے ہوئے۔ ایک روز انہوں نے میرے ساتھ گلہ کیا۔ "اگر ہر خرچ کی منظور فنانس ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کرنی ہے اور ہر چیک اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر سے جاری ہونا ہے تو وزیر خزانہ کس مرض کی دوا رہ جاتا ہے؟"

خواجہ غلام دین وانی دھیمے مزاج کے روشن دماغ اور خاموش طبع وزیر تھے۔ وہ اپنے فرائض وزیرانہ دم خم سے کم اور فقیرانہ انداز سے زیادہ سر انجام دیتے تھے۔ ان کا تعلق وادی

For more books visit www.4Urdu.com

کشمیر سے تھا اور وہ مقبوضہ علاقے کے تمام بڑے بڑے قائدین مثلاً شیخ عبداللہ' مرزا افضل بیگ اور بخشی غلام محمد کے طور طریقوں اور عادات و خصائل سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ثناء اللہ شمیم صاحب کا تعلق بھی وادی کشمیر سے تھا۔ وہ پڑھے لکھے' جوشیلے' انقلاب پسند اور سیماب صفت جواں سال وزیر تھے۔ وہ اپنے محکموں کی کارکردگی اور کارگزاری پر مضبوط گرفت رکھتے تھے اور بحث مباحثہ اور منطق و استدلال میں ان سے بازی لے جانا امر محال تھا۔

میرے زمانے میں کچھ عرصہ بعد میر واعظ محمد یوسف شاہ بھی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ وادی کشمیر کے ایک عظیم رہنما تھے جہاں پر ان کے لاکھوں مرید تھے۔ سنا ہے کہ ان کے بعض مریدوں کے دل میں ان کے لیے اتنا گہرا جذبہ عزت و احترام تھا کہ جس قالین پر میر واعظ صاحب ایک بار بیٹھ جاتے تھے اس پر کوئی شخص دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسے قالینوں کو گھر والے تبرک دیوار پر آویزاں کر دیتے تھے۔

میر واعظ صاحب محض زاہد خشک نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی' لطیفہ گوئی اور پر لطف محفل آرائی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ دھیمی دھیمی مہین سی آواز میں وہ مزاح ہی مزاح میں ایسے پتے کی بات کہہ جاتے تھے کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا۔ میرے ساتھ وہ نہایت مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے اور رات کا کھانا اکثر مجھے اپنے ساتھ کھلانے پر اصرار فرمایا کرتے تھے۔ غریب الوطنی کے باوجود ان کا دستر خوان بڑا وسیع ہوتا تھا۔ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد اب اس طرح کے کشمیری کھانے خواب و خیال ہو گئے ہیں۔

میر واعظ صاحب جعلی پیروں فقیروں کے ہتھکنڈوں کے متعلق عجیب و غریب حکایات سنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر دو واقعات قابل بیان ہیں۔

ایک جعلی پیر صاحب کا معمول تھا کہ وہ صرف جمعرات کے دن اپنے مریدوں یا دیگر حاجت مندوں کو تعویذ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ جب فاؤنٹین پین نئے نئے ایجاد ہوئے تو پیر صاحب نے اسے بھی اپنی جملہ کرامات میں شامل کر لیا۔ وہ اس طرح کہ جمعرات

For more books visit www.4Urdu.com

کو وہ اپنے قلمدان کی روشنائی پھنکوا کر خالی دوات اپنے سامنے رکھ لیتے۔ البتہ فاؤنٹین پین کو سیاہی سے بھر کر قلمدان میں سجا لیتے تھے۔ غرض مند لوگ دور دور سے پاپیادہ تعویذ لینے آتے تھے۔ پیر صاحب کی خدمت میں نذرانہ پیش کر کے اپنی حاجت بیان کرتے تھے۔ پیر صاحب تعویذ لکھنے کے لیے فاؤنٹین پین کو دوات میں ڈبوتے تھے۔ اسے خالی پا کر قلم واپس رکھ دیتے تھے اور سرد آہ بھر کر افسوس کرتے تھے۔ "اوہو' آج تو سیاہی ختم ہے۔ خیر اگلی جمعرات کو آ جانا۔ تعویذ لکھ دوں گا۔" دس دس یا بیس کوس سے پیدل آیا ہوا حاجت مند مایوس ہو کر جانے لگتا تو پیر کے چھوڑے ہوئے دلال اسے حضرت پیر و مرشد کے ابر کرم کو جوش میں لانے کی ترکیبیں سمجھاتے۔ حاجت مند از سر نو پیر صاحب کے قدموں میں پہلے سے تین گنا نذرانہ ڈالتا اور گڑگڑا کر آہ و زاری کرتا کہ اللہ اور رسول کی خاطر میری دستگیری فرمایئے۔ پیر صاحب زچ ہو کر کہتے۔ "اوہو' آپ لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ اچھا خیر اللہ مالک ہے۔" وہ کچھ پڑھ کر فاؤنٹین پین پر پھونک مارتے اور پیر و مرشد کی کرامت سے دوات میں سیاہی کے بغیر قلم ڈبو کر وہ کھٹ سے تعویذ لکھ دیتے۔

ایک دوسرے پیر صاحب نے پہلے پہل بیٹری والی ٹارچ کی ایجاد سے بھی ایسا ہی فائدہ اٹھایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جو شخص ان کے پاس رہ کر چالیس دن کا چلہ کاٹ لے' وہ کھلی آنکھوں سے اللہ کے نور کا دیدار کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے پاس چلہ کاٹنے آئے۔ ان چالیس ایام کے دوران پیر صاحب ہر شخص سے روزانہ صدقہ کے لیے ایک بکرا اور دوسری خیر خیرات کے لیے کچھ رقم بٹورتے رہتے تھے۔ چلہ کاٹنے والے دن بھر روزہ رکھتے تھے اور رات بھر عبادت اور ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ چالیسویں دن پیر صاحب اگر بتیوں اور عود و لوبان سے مہکائے ہوئے حجرے میں چلہ کش کو اپنے سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے اور اس کے چہرے کو اپنے فرن (کشمیریوں کا ٹخنوں تک لانبا کرتہ نما پیراہن) میں ڈال اسے حکم ہوتا تھا کہ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرے اور

For more books visit www.4Urdu.com

پلکوں کو جھپکائے بغیر اپنی آنکھیں پوری توجہ سے پیر صاحب کے قلب کی جانب ٹکٹکی باندھ کر جمائے رکھے۔ حجرے میں بہت سے مریدان باصفا حلقہ باندھ کر ذکر جہر کی محفل برپا کرتے تھے۔ اس ڈرامائی ماحول میں کسی خاص لمحے پر پیر صاحب اپنے فرن میں چھپائی ہوئی ٹارچ کا بٹن دبا کر اس کی شعاعوں سے اپنے سینہ کو بقعہ نور بنا دیتے۔ بعض چلہ کش "نور الٰہی" کے اس دیدار کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔

یہ کہانیاں سنا کر میر واعظ محمد یوسف شاہ فرمایا کرتے تھے کہ اصلی کرامات تو انسان کی اپنی عقیدت مندی میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ روشنائی سے خالی دوات میں "قلم" ڈبو کر لکھے ہوئے تویذ زیادہ موثر ثابت ہوتے تھے اور چالیس ایام کی نفس کشی اور عبادت و ریاضت کے بعد بیٹری ٹارچ کی آڑ میں "نور الٰہی" کے دیدار سے مشرف ہونے والے اکثر افراد اپنی بقیہ زندگی سچ مچ عابد شب زندہ دار بن کر گزار دیتے تھے!

کچھ عرصہ کے بعد صوبہ جموں کے چوہدری عبداللہ بھلی بھی کرسی وزارت پر متمکن ہوئے تھے۔ یہ بڑے سادہ لوح اور دلچسپ انسان تھے۔ ایک روز میں ان کے ہمراہ بھمبر اور کوٹلی کی جانب دورے پر گیا ہوا تھا۔ ایک مقام پر ہم کسی کام کے لیے ٹھہرے تو اچانک فضا میں دو تین بھارتی بمبار طیارے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر اٹکل پچو سے چند بم گرا کر چلتے بنے۔ بھلی صاحب انتہائی رازداری سے سرگوشی میں بولے: "واہ بھئی واہ۔ ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی نے بھی کمال کر دیا۔ ہمارے پہنچتے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ آج گورنمنٹ یہاں آئی ہوئی ہے اور ان کے طیارے بم لے کر فوراً آ موجود ہوئے!"

جموں کے باسی کیپٹن نصیر الدین بڑی سوجھ بوجھ کے مالک' متحمل اور بردبار وزیر تھے۔ ان کی ساری ملازمت انڈین پولیٹیکل سروس میں گزری تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ قلات کے وزیراعظم بھی رہ چکے تھے۔ آزاد کشمیر کی کابینہ میں کافی تاخیر کے بعد شامل ہوئے اور بعدازاں کسی وقت صدارت کی کرسی پر بھی بیٹھے۔

پاکستان میں چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شیخی میں آ کر میں

For more books visit www.4Urdu.com

نے آزاد کشمیر پہنچ کر اپنے عہدہ کا نام بھی سیکرٹری جنرل رکھ لیا تھا۔ اس پر چوہدری صاحب نے سرزنش کر کے مجھے ٹوکا کہ مجھے اپنے عہدے کا لقب چیف سیکرٹری رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو اب یہ غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اب فوری طور پر اسے بدلنے میں مقامی سطح پر بہت سی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ البتہ میرے بعد اگر اس عہدے کو چیف سیکرٹری کا نام دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چوہدری صاحب میری بات مان گئے۔ چنانچہ آجکل آزاد جموں و کشمیر کی حکومت میں چیف سیکرٹری ہی مقرر کیا جاتا ہے۔

جنجال ہل میں میرے دوسرے رفقائے کار بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان جیسے محنتی' دیانت دار' سچے اور نڈر افسروں کی اتنی بڑی متحدہ جماعت مجھے ساری عمر اور کہیں نظر نہیں آئی۔ یہاں پر ان سب کا نام بنام ذکر کرنا تو امر محال ہے۔ البتہ مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا کچھ احوال بیان کرنا باعث دلچسپی ہو گا۔

سرفہرست مجھے محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کیپٹن محمد صفدر کا نام یاد آتا ہے۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور انگلستان سے تاریخ میں ایم' اے کر چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں کچھ عرصہ ایمرجنسی کمیشن حاصل کر کے فوجی ملازمت کی۔ پھر پنجاب میں کسی کالج میں ملازم ہو گئے۔ جب کشمیر میں جہاد آزادی نے زور پکڑا' تو استعفیٰ دے کر حکومت آزاد کشمیر میں آ گئے۔ وہ جذبہ جہاد کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہ کوئی تنخواہ قبول نہ کرتے تھے۔ آزاد علاقوں میں سرکاری دوروں کا سفر خرچ اور یومیہ بھتہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ وہ جہاد کی اصلی روح ساتھ لے کر کام کرنے آئے تھے اور اس کام کی کوئی اجرت حاصل کرنا صریحاً حرام سمجھتے تھے۔

ہمہ وقت کام کرنے کی ان میں ایسی لگن تھی کہ میں نے انہیں کبھی بیکار بیٹھے یا گپیں ہانک کر وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب آزاد کشمیر کا دارالحکومت مظفر آباد منتقل ہوا تو صفدر صاحب نے اپنی فائلوں کی بوری کندھے پر اٹھائی اور جنجال ہل سے

For more books visit www.4Urdu.com

URDU4U.COM

لگاتار چل کر سارا راستہ دو روز میں پاپیادہ طے کر لیا۔
محکمہ مال کے سیکرٹری راجہ محمد یعقوب تھے۔ وہ بڑے خوش لباس' خوش کلام اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ بے خوابی کے دیرینہ مریض تھے۔ کئی کئی راتیں مسلسل جاگ جاگ کر گزارنے کے باوجود دفتر میں بھی ہمیشہ دن بھر چاق و چوبند اور خوش و خرم ہی نظر آیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ بے خوابی کی وجہ سے ساری ساری رات جاگتے جاگتے انہوں نے انگریزی زبان کی ایک پوری ڈکشنری حفظ کر لی تھی۔ ان کا یہ جوہر ہمارے بہت کام آیا۔ جنجال ہل میں آزاد حکومت کے کسی دفتر یا ملازم کے پاس انگریزی کی کوئی ڈکشنری موجود نہ تھی۔ وہاں پر ہم سب ضرورت پڑنے پر راجہ صاحب ہی سے ایک چلتی پھرتی ڈکشنری کے طور پر استفادہ کر لیا کرتے تھے۔
قانون کی ڈکشنری خواجہ عبدالغنی کی ذات تھی۔ ہوم اور لاء سیکرٹری کی حیثیت سے وہ جیل خانوں سے لے کر ہائی کورٹ تک تمام قواعد و ضوابط کی رگ رگ سے واقف تھے۔ دیکھنے میں وہ نہایت بھولے بھالے اور سیدھے سادے نظر آتے تھے۔ لیکن پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو قانونی موشگافیوں کے سانچے میں ڈھال کر آسان اور عام فہم بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہنگامی احکام اور قوانین وغیرہ کے خاکے بنانے اور منظوری کے بعد انہیں باضابطہ مسودوں کی شکل دینے میں بھی انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ شدید ترین ہنگامی حالات اور بمباری کے دوران بھی وہ پرسکون رہتے تھے اور کسی گھبراہٹ کے آثار کے بغیر ان کا دماغ ان کے زیر غور مسودوں کی کتر بیونت پر مسلسل کام کرتا رہتا تھا۔
محمود ہاشمی حکومت آزاد کشمیر کے چیف پبلسٹی افسر تھے۔ وہ اپنی خوش کلامی' خوش بیانی اور ایک عجیب درویشانہ ادائے دلنوازی سے بہت جلد ہر کس و ناکس کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی ادیب تھے' کیونکہ ان کی بول چال اور تحریر و تقریر پر ایک واضح ادبی چھاپ ہوتی تھی۔ دن بھر وہ دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ہر روز شام

For more books visit www.4Urdu.com

کو یوسف بچ اور میں ان کو اپنے ہمراہ لے کر طویل سیر پر نکل جاتے تھے اور واپس آ کر لالٹین کی مدھم سی روشنی میں رات گئے تک گپ شپ ہانکا کرتے تھے۔ پھر اچانک ایک روز خبر ملی کہ محمود ہاشمی کی کتاب "کشمیر اداس ہے" شائع ہو کر بازار میں آ گئی ہے۔ میری طرح جس کسی نے اس کتاب کو پڑھا' وہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ ریاست کشمیر کے متعلق اس سے بہتر رپورتاژ اور کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے آج تک اس بات پر حیرت ہے کہ جھنجال ہل میں ہم سب کی نظر بچا کر محمود ہاشمی نے ایسی عجیب و غریب کتاب کب اور کیسے تصنیف کر ڈالی؟ کافی عرصہ سے اب یہ کتاب نایاب ہے۔ معلوم نہیں پاکستان بھر میں کسی پبلشر کو یہ کتاب دوبارہ شائع کرنے کا خیال اب تک کیوں نہیں آیا؟ کشمیر کا مسئلہ لٹکتا رہے یا حل ہو جائے' اس کتاب کی ادبی اہمیت اور افادیت دونوں صورتوں میں برقرار رہے گی۔

۱۹۵۳ء میں محمود ہاشمی اچانک انگلستان چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پہلے محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ پھر ریس ریلیشنز (Race Relations) کے اداروں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد لندن میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہفت روزہ "مشرق" عنایت اللہ مرحوم کے تعاون سے جاری کیا۔ اس اخبار کا ڈنکا کئی برس تک خوب بجتا رہا۔ پھر یہ ریت چل نکلی اور رفتہ رفتہ اردو صحافت نے انگلستان میں بھی اپنے پاؤں جما لیے۔

آجکل وہاں اردو کے غالباً دو روزنامے اور متعدد ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ انگریزی کی سرزمین پر اردو صحافت کا پودا لگانے کا سہرا محمود ہاشمی کے سر ہے۔ آجکل وہ ایک نئے انداز میں اردو زبان کا پہلا قاعدہ لکھ رہے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انگلستان میں مقیم لاکھوں پاکستانی بچوں کو اپنی قومی زبان سیکھنے میں آسانی ہو اور بہت سے انگریز جو شوقیہ طور پر یا ضرورتاً یہ زبان سیکھنے کے خواہشمند ہیں' ان کے کام بھی آ سکے۔

جنجال ہل میں شام کے وقت طویل سیر کے بعد گپ شپ کی شبینہ محفلوں میں دوسرے

For more books visit www.4Urdu.com

ساتھی یوسف بچ تھے۔ انگریزی پر انہیں ایسا عبور حاصل تھا' کہ ان کی تحریر پڑھ کر اہل زبان بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ دفتر میں بیٹھ کر فائلیں کرنے سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں تحریک آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس کے ساتھ ایڈوائزر کے طور پر لگا دیا گیا تھا۔ کیونکہ مشاورت کا کام زیادہ تر زبانی کلامی ہی ہوا کرتا تھا۔

جب محمود ہاشمی انگلستان سدھارے تو یہ بھی نیویارک چلے گئے اور یو۔ این۔ او میں پاکستانی سفارت خانہ کے ایک گوشہ میں آزاد کشمیر سینٹر (Free kashmir Centre) کھول کر بیٹھ گئے۔ یو۔ این۔ او کی جنرل کانفرنس اور سلامتی کونسل میں ہمارے مشاہیر جتنی تقریریں کرتے تھے' ان میں اکثر و بیشتر یوسف بچ کی ڈرافٹ کردہ ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بھی ان کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو انہوں نے یوسف بچ کو اپنے سپیشل اسسٹنٹ کے طور پر پاکستان بلا لیا۔ جاتے جاتے بھٹو صاحب انہیں سوئٹزر لینڈ میں بطور سفیر متعین کر گئے لیکن مارشل لاء کی حکومت نے بہت جلد انہیں اس عہدے سے فارغ کر دیا۔ یوسف بچ دوبارہ نیویارک جا پہنچے۔ وہاں پر یو این او کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈہیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے سٹاف میں شامل کر لیا۔ نئے سیکرٹری مسٹر کوئیر نے آ کر ان کی اسامی کو اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل کا رتبہ دے دیا۔ پروفیسر پطرس بخاری کے بعد یوسف بچ واحد پاکستانی ہیں جو یو۔ این۔ او کے ادارے میں اس رتبے کی اسامی پر فائز ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو حکومت پاکستان کی پوری پوری تائید حاصل تھی۔ یوسف بچ نے محض ذاتی اہلیت اور حسن خدمت کی بنا پر یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی مرحوم کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ اس لیے میں ان کا ادب و احترام اپنے بزرگوں کی طرح کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بچہ سمجھ کر ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ آزادی سے پہلے وہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی مہارانی کے ذاتی معالج بھی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں مہاراجہ اور مہارانی کے محلات کے اندرونی کوک شاستروں کا پورا علم تھا۔ کبھی کبھی وہ موڈ میں

For more books visit www.4Urdu.com

آ کر ڈوگرہ حکمران کی ذاتی زندگی کے بارے میں عجیب و غریب قصے سناتے تھے۔ جیسے ہی اس طلسم ہوشربا کا رخ مہاراجہ اور مہارانی کی جنسی بے رہ رویوں کی طرف مڑتا تھا' تو ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے۔ "کافی دیر ہو گئی ہے۔ بچوں کو جا کر اب سو جانا چاہیے!"

ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کے فوجی میڈیکل یونٹ کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر کے طول ع عرض میں ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا ایسا نظام قائم کیا جو ڈوگرہ مہاراجہ کے عہد میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ جنگ بندی کے بعد جب مسئلہ کشمیر کے حل کا امکان دور سے دور تر ہوتا چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی مایوس ہو کر سیالکوٹ چلے آئے۔ یہاں پر انہوں نے دین اسلام کی روح اور عمل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور زندگی کے آخری ایام انہوں نے کچھ ایسے کیف و مستی و سرور میں کاٹے جسے حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے زاہد و عابد ساری ساری عمر ذکر شغل اور مراقبہ و مجاہدہ میں گزار دیتے ہیں۔ ہمارے نامور صاحب طرز انگریزی زبان کے صحافی خالد حسن ڈاکٹر صاحب کے بیٹے' قائداعظم کے سیکرٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید ان کے داماد ہیں۔

ڈاکٹر نور حسین ہمعصر اور دوست انور شیخ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہاں پر انہوں نے یونین کے مباحثوں میں نمایا حصہ لے کر بڑا نام پیدا کیا' وہیں پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی استوار ہو گئے تھے۔ کشمیر واپس آ کر انہوں نے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازمت تو ضرور اختیار کر لی تھی لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ کانفرنس کی سیاست سے وابستہ رہے۔ جہاد کشمیر کے آغاز کے بعد جب شیخ عبداللہ ہندوستانی سنگینوں کے سائے میں اقتدار میں آئے تو انہوں نے انور شیخ کو اعلانیہ طور پر پاکستان کے حق میں سرگرم عمل پا کر کافی عرصہ تک جیل میں ٹھونسے رکھا۔ رہائی کے بعد ان کو بھی آزاد کشمیر میں یوسف بچ کی طرح چوہدری غلام عباس کے ساتھ بطور

For more books visit www.4Urdu.com

مشیر متعین کر دیا گیا۔

ان سب سے نرالی اور دلچسپ شخصیت حسام شاہ کی تھی۔ وہ سرینگر کے ایک متمول اور بارسوخ خاندان کا چشم و چراغ تھا' جس کا بیشتر حصہ مقبوضہ کشمیر ہی میں رہ گیا تھا۔

URDU4U.COM

جب وہ پہلی بار مجھے ملنے آیا' تو میں نے پوچھا کہ وہ خود سوچ کر بتا دے کہ یہاں پر اسے کس نوعیت کا کام سپرد کرنا چاہیے۔ اس نے فوراً نہایت سادگی سے جواب دیا کہ اسے کوئی خاص کام نہیں آتا۔ گرمیوں کے سیزن میں ہندوستان بھر سے جو مسلمان مشاہیر سرینگر آتے تھے' حسام شاہ کے گھر والے اکثر اس کی ڈیوٹی ان کی خاطر مدارت اور دیکھ بھال پر لگا دیا کرتے تھے۔ اس طرح علامہ اقبال سمیت ہندوستان کے تقریباً تمام نامور مسلمانوں کے ساتھ اس کی روشناسائی تھی۔ حسام شاہ نے کسی قدر معتذرانا لہجے میں کہا' "جناب مجھے تو بس دوسروں کی خدمت کرنے کا تجربہ ہے۔اس میں مجھے خود بھی لطف آتا ہے۔"

حسام شاہ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی۔ رسمہ ملازمت تو اس کی سول سپلائی کے محکمے میں مقرر کر دی گئی' لیکن عملاً میں نے اس سے کام چیف آف پروٹوکول کا ہی لیا۔ اس کام کو شائستگی سے نبھانے کی اہلیت بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

عبدالمجید سلہریا کا نام شامل کئے بغیر آزاد کشمیر میں میرے ہمعصروں کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ میرے زمانے میں وہ محکملہ جنگلات میں کنزرویٹو تھے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے چیف کنزرویٹو اور ترقیاتی محکموں کے سیکرٹری بھی رہے۔ اگر کسی نے اس بگڑے ہوئے' فاسد اور ناقص زمانے میں اپنی آنکھوں سے ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو شروع ہی سے جوان صالح رہا ہو' جس نے زندگی بھر دیانت' امانت اور سچائی کا دامن نہ چھوڑا ہو' جس کے خون میں لقمہ حلال کے علاوہ اور کسی خوراک کی آمیزش نہ ہو' اور جو ہر آزمائش میں اللہ کی رضا' توکل اور تقویٰ پر ثابت قدم رہا ہو تو وہ عبدالمجید سلہریا کو دیکھ لے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں اپنی معمولی سی پنشن

For more books visit www.4Urdu.com

پر صبر و شکر سے گزارا کر رہا ہے۔ جنگلات کا محکمہ سونے کی کان سمجھا جاتا ہے۔ سلہریا اس سونے کی کان سے دامن بچا کر اس قدر پاک و صاف نکلا کہ اس کا کردار بذاب خود سونا بن گیا۔

URDU4U.COM

باقی سارا کام تو میں نے سنبھال لیا' لیکن محکمہ پولیس کی تنظیم نو میرے بس کا روگ نہ تھی۔ اس مقصد کے لیے پنجاب کے ایک ڈی۔ آئی۔ جی سید نذیر عالم ڈیپوٹیشن پر آزاد کشمیر آ گئے۔ کسی مصلحت سے یہاں آ کر انہوں نے اپنا نام مسٹر ضرار رکھ لیا۔

وہ انڈین پولیس سروس کے ایک تجربہ کار افسر تھے اور بڑی شاہانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا اپنا قیام تو راولپنڈی کے سرکٹ ہاؤس میں ہوتا تھا جہاں وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہا کرتے تھے۔ لیکن آزاد کشمیر میں پے درپے دورے کر کے انہوں نے محکمہ پولیس کو ازسر نو منظم کرنے میں بڑی گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ ان کو آئے ہوئے تھوڑا عرصہ گزارا تھا کہ ایک روز میں اچانک ان سے ملنے راولپنڈی سرکٹ ہاؤس چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ کچھ لوگ برآمدے میں جمع ہیں اور ضرار صاحب درمیان میں بیٹھے چند قیمتی بندوقیں فروخت کر رہے ہیں۔ اس خرید و فروخت کے بعد جب ہم دونوں اکیلے رہ گئے' تو میں نے پوچھا کہ انہیں اپنی خوبصورت بندوقیں یکایک فروخت کرنے کی کیوں سوجھی؟

"بھائی' کیا کرتا؟" وہ بولے۔ "ڈھیر سارے بل جمع ہو گئے تھے۔ انہیں ادا کئے بغیر یہاں سے کیسے چلا جاتا؟"

"یہ آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہاں سے کون جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟"

"میں جا رہا ہوں۔ یہ تار مجھے کل شام ملا تھا۔" ضرار صاحب نے ایک سرکاری ٹیلیگرام میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ پنجاب کے چیف سیکرٹری کا تار تھا' جس میں سید نذیر عالم ڈی۔ آئی۔ جی کے لیے مرکزی حکومت کے یہ احکام درج تھے کہ وہ فوراً بہاولپور روانہ ہو جائیں جہاں پر ایک انتہائی

For more books visit www.4Urdu.com

اہم انکوائری ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔
میرے استفسار پر عالم صاحب نے قیاساً یہ بتایا کہ ممکن ہے یہ انکوائری بہاولپور کے سابق وزیراعظم نواب مشتاق احمد گورمانی کے بارے میں ہو۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے ان کے متعلق پبلک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔
سید نذیر عالم کا یوں اچانک آزاد کشمیر سے چلے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ان کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کے علاوہ ان کی دیانت داری اور خوش اخلاقی کا درجہ بھی بڑا بلند تھا۔
اس واقعہ کے چند روز بعد میں اپنی جیپ میں سوار راولپنڈی کی مال روڈ پر گزر رہا تھا تو دیکھا کہ ریس کورس کے نزدیک سید نذیر عالم خراماں گھوڑ سواری کا شوق فرما رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر رک گئے۔ میں نے پوچھا' "کیا آپ ابھی تک بہاولپور نہیں گئے؟"
"میں لاہور تک تو پہنچا تھا۔" وہ ہنس کر بولے۔ "وہاں پر کراچی سے حکم آ گیا کہ انکوائری موقوف ہو گئی ہے۔"
"چلو اچھا ہوا" میں نے کہا۔ "اب آزاد کشمیر میں واپس آ جایئے۔"
"ناں بھائی ناں۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "میری توبہ۔ ب میں وہاں کیسے آ سکتا ہوں؟"
"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ابتدائے عشق ہی روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" انہوں نے ذومعنی انداز سے یہ شعر الاپ کر پڑھا۔
میں نے گلہ کیا کہ ان کی یہ پہیلی میری سمجھ میں نہیں آئی۔
"تھوڑی دیر صبر سے کام لو۔" وہ بولے۔ "رفتہ رفتہ ساری بات سمجھ لو گے۔"
چند ماہ بعد جنگ بندی کے احکام نافذ ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی طرح طرح کی افواہوں کا تانتا لگ گیا۔ ایک افواہ جو بہت جلد حقیقت بن گئی یہ تھی کہ بہاولپور کے سابق وزیراعظم نواب مشتاق احمد گورمانی امور کشمیر کے وزیر بن کر راولپنڈی تشریف لا رہے ہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

جولائی ۱۹۴۸ء میں "اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان" (United Nations Commission for India and Pakistan - UNCIP) کراچی پہنچا اور اس نے بھارت، پاکستان، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے قائدین سے رابطہ قائم کر کے مسئلہ کشمیر کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک روز اس کمیشن کو آزاد کشمیر حکومت کی جانب سے منگلا کے مقام پر لنچ کی دعوت دی گئی۔ کمیشن کے دو رکن امریکہ کے مسٹر ہڈل۔ اور بلجیم کے مسٹر جریف سفیروں کا درجہ رکھتے تھے۔ میری یہ ڈیوٹی لگی کہ مشایعت کی غرض سے راولپنڈی سے منگلا تک موٹر کے سفر کے دوران میں ان کے ہمرکاب رہوں۔ میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھے۔ وہ چند روز قبل نئی دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ پٹیل سے مل کر آئے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹہ کے اس سفر کے دوران وہ مسلسل ان ملاقاتوں پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ میں بھی آگے بیٹھا کان لگا کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ بھارتی قیادت نے چکنی چپڑی باتیں کر کے ان دونوں کو کسی طرح سے یہ باور کرایا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج صرف دفاعی غرض و غایت سے بیٹھی ہے اور آزاد کشمیر میں پاکستانی اور آزاد افواج کا واحد مقصد جارحیت اور ملک گیری ہے۔ چنانچہ کمیشن کا اولین فرض یہ ہے کہ سب سے پہلے پاکستانی فوج کو آزاد کشمیر سے مکمل طور پر باہر نکالا جائے اور ساتھ ہی ساتھ آزاد مجاہدین کو بھی پوری طرح نہتا کر دیا جائے۔ اب کمیشن کے یہ دونوں مدبر اراکین موٹرکار میں بیٹھے ہوئے سر سے سر جوڑ کر ہندوستان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عملی تدابیر و وسائل پر انتہائی سنجیدگی سے غور و خوض کر رہے تھے۔ مجھے ان فریب خوردہ سفیروں کے ارادوں سے خطرے کی بو آئی۔ منگلا پہنچتے ہی میں نے ایک مختصر سی رپورٹ تیار کی۔ جسے ایک مقامی فوجی کیمپ کے ذرائع رسل و رسال سے فوراً چوہدری محمد علی کو بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک نقل میں نے وزیراعظم لیاقت علی

For more books visit www.4Urdu.com

خان کے نام بھی ارسال کر دی۔ وہ کشمیر لبریشن کمیٹی کے صدر تھے اور ہر ماہ راولپنڈی تشریف لا کر اس کمیٹی کی میٹنگ کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے ان تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ اپنی رپورٹ کی تیسری نقل میں نے جسٹس دین محمد کی خدمت میں پیش کر دی جو اس کمیٹی کے اہم رکن تھے اور بعد میں اس کے صدر بھی رہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری اس رپورٹ پر کسی نے کوئی دھیان دیا یا نہیں۔ البتہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ ادھر کمیشن (UNICIP) نے ہمیں اپنے ساتھ مذاکرات میں الجھایا ہوا تھا' دوسری جانب بھارت نے اچانک ایک شدید حملہ کر کے وادی مینڈھر ہمارے قبضہ سے چھین لی اور راجوری اور پونچھ شہر کو آپس میں منسلک کر لیا۔ پونچھ شہر کا محاصرہ جو تقریباً سال بھر سے جاری تھا' ٹوٹ گیا اور وادی مینڈھر اور دوسرے مفتوحہ علاقوں سے دو لاکھ سے اوپر مہاجرین اپنے ہلکے ہلکے سامان کی گٹھڑیاں سروں پر اٹھائے' دشوار گزار پہاڑی راستوں کو پاپیادہ طے کرتے ہوئے پاکستان روانہ ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں' عورتوں اور بوڑھے مہاجرین کے اس قافلے کو بھی انڈین ایئر فورس کے جہازوں نے جگہ جگہ اور بار بار اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھارت نے لداخ کے محاذ پر ایک اور شدید حملہ کر کے ہمیں دراس اور کرگل سے نکال کر اسکردو تک دھکیل دیا۔ اس طرح لداخ تحصیل کا اپنے صدر مقام لیہہ کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا اور جموں سے لیہہ تک پورا راستہ بھارت کے قبضہ اختیار میں آ گیا۔

یو۔ این۔ کمیشن کے ساتھ صلح صفائی کی گفت و شنید کے دوران بھارت کے ان جارحانہ فوجی پیش قدمیوں اور کامیابیوں نے سارے آزاد کشمیر میں خوف و ہراس اور مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ آزاد مجاہدین نے آزاد کشمیر میں موجود فوجی کمانڈروں کے ساتھ مل کر بھارت کے مزید جارحانہ عزائم کی روک تھام کے لیے کئی دور رس منصوبے بنائے۔ پہلے انہوں نے محاذ پر آگے بڑھ کر کئی ایسے مقامات پر قبضہ جما لیا جہاں سے اکھنور اور بیری پتن

For more books visit www.4Urdu.com

میں دشمن کی نقل و حرکت صاف نظر آتی تھی۔ ان حرکات و سکنات سے عیاں ہوتا تھا کہ بھارت بھمبر پر حملہ کرنے کی بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ ہندوستان کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہماری افواج نے اکھنور اور نوشہرہ کے درمیان فوجی رسل و رسائل کی سڑک کو کاٹنے اور مناورتوی کے مغرب میں خاص طور پر چھمب پر حملہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! خدا جانے اس منصوبے کی بھنک ہندوستان کے کان میں پڑ گئی' یا اس کا علم یو۔ این۔ او کمیشن والوں کو ہو گیا کہ دسمبر کے دوسرے نصف میں کراچی سے اچانک چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم کو بلاوا آ گیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ کراچی گیا۔ وہاں پر وزیراعظم لیاقت علی خاں کے ہاں ایک ہنگامی میٹنگ تھی' جس میں وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں بھی موجود تھے۔ میں خود تو اس میٹنگ میں موجود نہ تھا' لیکن بعدازاں اس کا احوال چوہدری غلام عباس کی زبانی سنا۔ دونوں کشمیری لیڈروں کو حکومت پاکستان کے اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا کہ کشمیر میں جنگ بندی کی تجویز مان لی گئی ہے اور سیز فائر کے احکامات یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے نافذ ہو جائیں گے۔ یہ فیصلہ کشمیری لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر اور ان کو اعتماد میں لیے بغیر ہی کر لیا گیا تھا۔ غالباً دونوں لیڈر چھمب پر حملے کی تیاریوں سے کسی قدر آگاہ تھے۔ اس لیے چوہدری غلام عباس نے دریافت کیا کہ اس خاص موقع پر جنگ بندی کا فیصلہ تسلیم کرنے میں کونسی خاص وجوہات یا مصلحتیں ہیں؟ اس موضوع پر چوہدری غلام عباس اور چوہدری ظفر اللہ خاں میں خاصی گرما گرم بحث شروع ہو گئی' بلکہ تلخ کلامی تک نوبت آ گئی۔ لیکن فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا اور دونوں کشمیری قائدین اپنا سا منہ لے کر کراچی سے واپس آ گئے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے مسئلہ کشمیر یو۔ این۔ او کی قدیمی دستاویزوں کے محافظ خانے میں سال بہ سال جمع ہو کر مقفل ہوتا گیا۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اسے معاہدہ تاشقند کے تابوت میں ٹھونس دیا گیا۔ چھ برس بعد معاہدہ شملہ نے اس تابوت میں غالباً

For more books visit www.4Urdu.com

آخری کیل بھی گاڑ دی۔ اسے آخری کیل کا نام میں نے اس لیے دیا ہے کہ ہندوستان اتنا نازک مزاج ہو گیا کہ مسئلہ کشمیر کی مکھی اب اپنی ناک پر بیٹھنے نہیں دیتا۔ اگر ہم کسی بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کا ذکر تک کر بیٹھیں تو بھارت کو پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کشمیر کا نام لینا ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کے مترادف ہو گیا ہے

URDU4U.COM

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جنگ بند ہوتے ہی ہم نے حکومت آزاد کشمیر کا ہیڈ کوارٹر جنجال ہل (تراڑ کھیل) سے مظفر آباد منتقل کر لیا۔ کچھ دفاتر پرانی ضلع کچہری کے چند ٹوٹے پھوٹے کمروں میں سما گئے۔ باقی دفتروں کے لیے اسی عمارت کے احاطے میں بہت سے خیمے نصب ہو گئے۔ قریب ہی ایک ٹیلے پر سرکاری ملازموں کے لیے خیموں کی ایک رہائشی کالونی بھی وجود میں آ گئی۔ ان سب کے لیے ایک مشترکہ باورچی خانہ تھا اور سب کے لیے کھانے کا ایک بڑے خیمہ میں مشترکہ بندوبست تھا۔
مظفر آباد آ کر امن و امان کی فضا میں سانس لیتے ہی ہمیں پہلی بار آزاد کشمیر میں ٹیلیفون کی ضرورت کا احساس دامن گیر ہوا۔ میں نے مری آ کر مقامی پوسٹ آفس سے ٹرنک کال کر کے سردار عبدالرب نشتر کی خدمت میں آزاد کشمیر کی اس ضرورت کے متعلق گذارش کی تو چند روز بعد وہ مرکزی محکمہ ٹیلیفون کے چند بڑے افسران کرام کو ہمراہ لے کر خود ہی مظفر آباد تشریف لے آئے۔ یہاں پر انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر مظفر آباد کے علاوہ آزاد کشمیر کے دوسرے اہم مقامات پر بھی ٹیلیفون کا نہایت اچھا نظام رائج کرنے کے خصوصی احکام جاری کر دیئے۔ نشتر صاحب پاکستان کے پہلے مرکزی وزیر تھے جنہوں نے آزاد کشمیر میں قدم رنجا فرمایا تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی مرکزی وزرائے کرام نے جان کی امان پائی اور جوق در جوق اپنے ورد مسعود سے آزاد کشمیر کی سرزمین کو سرفراز فرمانے لگے۔ دو وزیروں کا دورہ خاص طور پر میرے دل پر نقش ہے۔ ان کی آمد پر دو میل کے پاس کئی سو افراد ان کے والہانہ استقبال کے لیے پل کے قریب جمع ہو گئے۔ دونوں وزیر کار سے نیچے اتر کر کچھ لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے' تو ایک چھوٹے موٹے جلسہ عام کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں نے بڑی جوشیلی استقبالی تقریریں کیں۔ سامعین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے اٹھ کر رقت بھری آواز میں کہا: جناب پاکستان ایک عظیم ملک ہے۔ آزاد کشمیر تھوڑا سا علاقہ ہے۔ آپ اس علاقے کو لیبارٹری اور ہم لوگوں کو تجرباتی چوہوں کی طرح استعمال میں لائیں۔ اسلامی احکامات اور قوانین کو پہلے یہاں آزمائیں اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں انہیں پاکستان میں نافذ کرنے کا سوچیں۔

اس بوڑھے کی یہ بات سن کر سارا مجمع سناٹے میں آ گیا۔ پھر اچانک دونوں میں سے ایک وزیر باتدبیر' جوش و خروش سے اٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔ جوش خطابت میں انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما سی چیز نکال کر مجمع کے سامنے لہرائی اور بولے: بھائیو' آپ اور ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اللہ کے قانون کو آزما آزما کر تجربہ کریں۔ یہ دیکھو یہ اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو برس پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی' اخلاقی اور ایمانی فرض ہے........" وزیر صاحب کی تقریر میں اسلامی جذبات ایسی شدت سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ سامعین میں سے چند رقیق القلب لوگ بے اختیار رو پڑے۔

واپسی پر احتراماً میں ان دو وزیرو صاحبان کو کوہالہ کے پل تک چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ایک وزیر نے دوسرے وزیر کی شاندار تقریر پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسانے کے بعد پوچھا: "بھائی صاحب' آپ کے پاس قرآن شریف کا لاکٹ بڑا خوبصورت ہے' یہ تاج کمپنی کا بنا ہوا ہے یا کسی اور کا؟"

For more books visit www.4Urdu.com

دوسرے وزیر صاحب کھلکھلا کر ہنسے اور لاکٹ جیب سے نکال کر بولے۔ "ارے کہاں بھائی صاحب' یہ تو محض سگریٹ لائٹر ہے!"

وزیروں کی یہ جوڑی ملک غلام محمد اور نواب مشتاق احمد گورمانی پر مشتمل تھی۔

URDU4U.COM

سیکرٹری جنرل کے طور پر میں نے آزاد کشمیر کا پہلا بجٹ بنایا۔ آمدنی کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار روپے کے قریب تھا اور اخراجات کا اندازہ دو لاکھ روپے کے لگ بھگ تھا۔ حکومت پاکستان سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی امداد حاصل کرنے کے لیے میں اپنا بجٹ لے کر کراچی میں حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چوہدری محمد ولی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے اس بات پر ڈانٹا کہ میں نے اپنے عہدے کا نام چیف سیکرٹری کی بجائے سیکرٹری جنرل کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ میں نے معافی مانگ کر گزارش کی کہ اب تو یہ غلطی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہیں۔ میرے بعد بے شک اس اسامی کا نام چیف سیکرٹری رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اب یہ عہدہ اسی نام سے موسوم ہے۔

میرے بنائے ہوئے بجٹ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر چوہدری صاحب نے کاغذوں کا پلندہ میز پر دے مارا اور کسی قدر ترشی سے بولے۔ "ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی رقم پاکستان کے درختوں پر نہیں اگتی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم مقامی وسائل کو کام میں لا کر اپنے بجٹ کی ضروریات پوری کرو۔"

جنگ کی وجہ سے مقامی طور پر غیر معمولی دشواریاں کا رونا رو کر میں نے مزید منت سماجت کی' تو چوہدری صاحب کسی قدر پسیجے اور انہوں نے بڑی مشکل سے مبلغ نوے ہزار روپے کی امداد منظور کی۔ یہ منظوری لے کر میں عبدلقادر صاحب کے پاس پہنچا جو اس زمانے میں وزارت فنانس میں غالباً جائنٹ سیکرٹری تھے۔ بعد میں وہ پاکستان کے وزیر خزانہ بھی رہے۔ انہوں نے میرے سامنے راولپنڈی میں شجاعت علی صدیقی ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کو ٹیلیفون کر دیا کہ وہ فلاں فنڈ سے آزاد کشمیر حکومت کو نوے ہزار روپے کی رقم ادا

For more books visit www.4Urdu.com

کر دیں۔ آزاد کشمیر کے ساتھ لین دین کے معاملات میں صدیقی صاحب "محتسب" کہلاتے تھے۔

شجاعت علی صدیقی صاحب بھی مرد مومن کی ایک جیتی جاگتی اور پر اثر تصویر تھے۔ مسجدیں تعمیر کرنا اور انہیں بنا سنوار کر آباد رکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میں جتنی بار ان سے ملنے کے دفتر یا گھر گیا ہوں' تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ نماز کا وقت آنے پر وہ وہیں پر باجماعت نماز کا اہتمام کر لیتے تھے۔ ان کا رہن سہن انتہائی سادہ اور ظاہر و باطن شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ سنا ہے کہ راولپنڈی میں سیٹلائٹ ٹاؤن قائم کرنے کا منصوبہ انہی کے ذہن رسا کی اختراع تھا۔

آزاد کشمیر میں ضلع کی سطح پر کام سنبھالنے کے لیے ہم نے پنجاب گورنمنٹ سے چند پی۔ سی۔ ایس افسر ڈیپوٹیشن پر بھی لیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کا نام کیپٹن میاں محمد سعید تھا۔ ۱۹۵۲ء کے دوران جب میں جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا' تو حسن اتفاق سے یہ بھی ضلع میں متعین تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار آزاد کشمیر میں میرے ان کے ساتھ نہایت خوشگوار تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ میاں صاحب بے حد صاف گو' بے باک محنتی اور دیانت دار افسر تھے۔ ایک بار انہیں راولپنڈی سے پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر تنخواہیں تقسیم کرنے کے لیے پلندری بھیجا گیا۔ سڑک بھی خراب تھی اور بارش بھی موسلا دھار برس رہی تھی۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں جیپ پھسل کر ایک گہری کھڈ میں جا گری۔ میاں سعید کے نہاتی شدید زخم آئے اور بہت سی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اپنی تکلیف بھلا کر انہوں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا بیگ اپنی بغل میں دبایا اور اس کی حفاظت کرنے کے لیے مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ حادثہ کی خبر سن کر آس پاس کے بہت سے دیہاتی بھی جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ شدید زخموں کے باوجود میاں صاحب سرکاری رقم کی حفاظت کی وجہ سے پریشان ہیں تو سب نے مل کر بہ یک آواز درخواست کی کہ وہ آرام سے لیٹ جائیں۔ یہ رقم بیت المال

For more books visit www.4Urdu.com

کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب ایک امدادی ٹیم وہاں پہنچی تو میاں صاحب زخموں کی تاب نہ لا کر نڈھال ہو چکے تھے اور سرکاری

URDU4U.COM

رقم دیہاتیوں کی حفاظت میں جوں کی توں موجود تھی۔

جس مقام پر اب منگلا ڈیم واقع ہے' وہاں پر پہلے میر پور کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شہر کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیپ میں بٹھائے اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہماری جیپ کو روک کر دریافت کیا۔ "بیت المال کس طرف ہے؟" آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟"

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میر پور شہر کے ملبے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دو بوریاں جمع کی ہیں۔ اب انہیں اس کھوتی پر لاد کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں۔"

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور بوریوں کو جیپ میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تاکہ انہیں بیت المال لے جائیں۔

آج بھی جب وہ نحیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہیے تھا کہ میں ان کے گرد آلود پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھوں۔ ایسے پاکیزہ سیرت لوگ پھر کہاں ملتے ہیں؟

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!

یو این کمیشن کے ایک سب کمیشن نے "مقبوضہ کشمیر" اور "آزاد کشمیر" میں نظم و نسق

For more books visit www.4Urdu.com

کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے دونوں علاقوں کے تفصیلی دورے کئے تھے۔ سب کمیشن کا ایک رکن مسٹر رچرڈ سائمنڈز تھا' جو ۱۹۴۳ء میں قحط بنگال' سیلاب اور سائیکلون کی تباہ کاریوں کے بعد فرینڈز ایمبولینس یونٹ (friends Ambulance Unit) کی جانب سے تملوک میں میرے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس وجہ سے ہماری آپس میں تھوڑی سی بے تکلفی تھی۔ یہ وہی مسٹر سائمنڈز ہیں جو Making of Pakistan کے مصنف بھی ہیں۔ پاکستان پر انگریزی میں یہ اگر پہلی نہیں تو اولین چند کتابوں میں سے ایک ضرور ہے۔

URDU4U.COM

آزاد کشمیر کے نظم و نسق میں ہمارے پاس کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو ہم بڑھا چڑھا کر سب کمیشن کے سامنے نمائش کے طور پر پیش کر سکتے۔ ہماری ایڈمنسٹریشن سادہ تھی۔ افسر دیانت دار اور محنتی تھے۔ لوگ جہاد کے جذبہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ دشمن کے حق میں شمشیر بے نیام اور آپس میں ہمدرد اور غمخوار تھے۔ مقبوضہ کشمیر سے واپسی کے بعد ایک بار مسٹر سائمنڈز نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا' اس جانب رقبہ زیادہ' وسائل بے شمار اور ہندوستان کی سول اور فوجی پشت پناہی بے حساب ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کے بیشتر امور میں زور اور زبردستی' دھونس اور دھاندلی' بے صبری' بے ایمانی اور نمائشی ملمع کاری کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ فرق اپنی رپورٹ میں واضح طور پر بیان کریں گے؟ وہ ہنس کر ٹال گئے اور بولے "ہمارا مقصد فرق نمایاں کرنا نہیں بلکہ پلڑا برابر رکھنے کی کوشش کرنا ہے!"

جنگ بندی کے بعد بہت جلد آزاد کشمیر سے میرا جی بھر گیا۔ اسی زمانے میں راولپنڈی میں وزارت امور کشمیر نئی نئی قائم ہوئی تھی اور نواب مشتاق احمد گورمانی اس کے وزیر انچارج تھے۔ وزارت کا دفتر ضلع کچہری کے مقابل ایک متروکہ عمارت "شہزادہ کوٹھی" میں کھولا گیا تھا۔ گورمانی صاحب کی رہائش اس شاندار بلڈنگ میں تھی جسے چوہدری فضل الٰہی کے زمانے میں ایوان صدر کے طور پر استعمال میں لایا گیا تھا۔ آزاد کشمیر سے مجھے کسی قدر

For more books visit www.4Urdu.com

اکتایا ہوا دیکھ کر چوہدری محمد علی نے مجھے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر وزارت امور کشمیر میں متعین کر دیا۔

اس زمانے میں گورمانی صاحب کی بہت سی ادائیں نرالی تھیں۔ وہ رات بھر جاگ کر اپنا دربار لگاتے اور دن بھر سوتے تھے۔ ان کے اس لائحہ عمل کی پابندی نبھانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ہمیشہ ناخوش ہی رہتے تھے۔

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے گورمانی صاحب کے ہاتھ میں کوئی ایسا کام نہ تھا جس میں وہ اپنی مثبت صلاحیتوں کو بروائے کار لا سکتے۔ چنانچہ ان کی توجہ کا سارا نزلہ بچارے آزاد کشمیر پر ہی گرا۔ یہاں پر ان کی حکمت عملی اور ریشہ دوانیوں نے آزاد کشمیر کی قیادت میں ایسے ایسے تفرقے ڈالے جو آج تک رفو نہیں ہو سکے۔ رفتہ رفتہ منسٹری آف کشمیر افئیرز Ministry of Kashmir Affairs کی بابت یہ پھبتی زبان زد خاص و عام ہو گئی کہ اس کے دائرہ عمل سے کشمیر تو غائب ہو گیا ہے اور اب اس کے پاس فقط Affairs ہی Affairs رہ گئے ہیں!

ایک بار سری پرتاب کالج سرینگر کا ایک بی ایس۔سی کا طلب علم ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کی گھٹن سے تنگ آ کر آزادی کا سانس لینے پاپیادہ گرتا پڑتا سیز فائر لائن عبور کر کے پاکستان آ پہنچا۔ راولپنڈی پہنچ کر وہ مجھے ملا اور اپنی دلی خواہش یہ بیان کی کہ وہ آزاد پاکستان کے کسی وزیر سے مل کر اس کی زیادرت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کوشش کر کے گورمانی صاحب کے ساتھ اس کی ملاقات کی منظوری حاصل کر لی۔ ملاقات کا وقت رات کے ڈیڑھ بجے مقرر ہوا۔ جون کا مہینہ تھا۔ آدھی رات گئے بھی شدید گرمی تھی۔ میں اس لڑکے کو ساتھ لے کر مقررہ وقت پر گورمانی صاحب کی شاندار قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ گورمانی صاحب کے کمرے میں کئی ٹن کا ائیرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہ گلے میں ایک سرخ ریشم ک اسکارف باندھے اور جسم پر ایک پشمینے کی چادر لپیٹے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ان کا محبوب حقہ پڑا تھا' جس کے خوشبودار تمباکو

For more books visit www.4Urdu.com

کی مہک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کشمیری لڑکے کو دیکھتے ہی گورمانی صاحب کا مزاج برہم ہو گیا اور انہوں نے اس پر پے در پے اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: تم سرینگر چھوڑ کر کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے اور کس مقصد کے لیے بھیجا ہے؟ واپس کب جاؤ گے؟ کیسے جاؤ گے؟ اور یہاں سے کیا لے کر جاؤ گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

URDU4U.COM

یہ غیر متوقع سوالات سن کر بیچارا لڑکا بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے صرف اتنا وجاب دیا کہ وہ صرف آزاد فضا میں سانس لینے یہاں آیا ہے۔ اب واپس جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں۔

یہ سن کر گورمانی صاحب کو پھر تاؤ آ گیا اور کسی قدر درشتی سے بولے۔ "پاکستان میں مہاجرین کی پہلے ہی کوئی کمی نہیں۔ خدا کا خوف کرو۔ یہ نوزائیدہ مملکت اس سیلاب کو کیسے سنبھالے گی؟"

اس کے بعد انہوں نے مہاجرین کی تکالیف اور مشکلات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور انگریزی میں لڑکے کو مخاطب کر کے کہا:

"Now that You have come, do'nt expect luxuries. All of us have to rough it out here."

یہ سن کر لڑکے کی رگ ظرافت بھی پھڑک اٹھی اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"Sir, If this room is roughing it out here, I am all for it!"

اس پر میں لڑکے کا بازو کھینچ کر اسے باہر لے آیا۔ ورنہ طیش میں آ کر گورمانی صاحب نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلے' تو میری درخواست پر اسے لاہور کے کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ مل گیا۔ آزاد کشمیر حکومت نے اسے وظیفہ دے دیا۔ لڑکا قابل تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا گیا اور آجکل ایک کامیاب اور خوشحال ڈاکٹر کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

چند ماہ بعد وزیراعظم لیاقت علی خاں کشمیر لبریشن کمیٹی کی صدارت کرنے راولپنڈی تشریف لائے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ جب وہ اکیلے رہ گئے تو فرمایا۔ "تمہارے وزیر گورمانی صاحب تم سے اس قدر ناخوش کیوں رہتے ہیں؟" میں نے عرض کیا۔ "سر' میرے خیال میں اس کی شدید دو وجوہات ہوں گی۔ ایک تو وہ رات کو کام کرتے اور دن میں سوتے ہیں۔ اس پروگرام میں ان کا ساتھ دینے سے میں بار بار چوک جاتا ہوں۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ وہ آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو آپس میں لڑاتے بھڑاتے رہتے ہیں۔ اس کاروائی میں میری روک ٹوک غالباً انہیں پسند نہیں آتی۔"

وزیراعظم کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اچانک انگریزی میں پوچھا۔

Tell me, is Gurmani Straight?

میں نے فوراً جواب دیا "No, Sir. He is not straight."

وزیراعظم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولے:

"I do not agree with you. He is as straight as a crokscrew!"

اس گفتگو کے چند ہفتہ بعد میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ جہاں پر مجھے وزارت اطلاعات و نشریات میں فارن پبلسٹی کا انچارج ڈپٹی سیکرٹری لگا دیا گیا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• صلہ شہید

جب میری پوسٹنگ کراچی میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر ہوئی تو آزاد کشمیر کی کھلی فضا کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پنجرے میں بند ہو گیا ہوں۔

URDU4U .COM

خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر تھے۔ مسٹر جی' احمد سیکرٹری اور شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ سیکرٹری تھے۔ اکرام صاحب بڑے عالم فاضل' شریف الطبع اور نیک دل انسان تھے۔ مسٹر جی' احمد بھی پڑھے لکھے آدمی تھے اور ان کے پاس کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ تھا۔ ان کا تعلق پولیس سروس سے تھا' اور Intelligence کے کام میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ طبعاً وہ اپنے زیردستوں سے کھنچے کھنچے اور زبردستوں کے سامنے جھکے جھکے رہتے تھے۔ جو فائل اوپر منسٹر یا پرائم منسٹر تک جاتی ہو' اس کی نوک پلک سنوارنے میں وہ خاص محنت کرتے تھے۔ نیچے کی سطح کی فائلوں پر ٹھیٹ پولیس آفیسر کی طرح فقط احکامات صادر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو کسی قدر شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا بھی ان کا شیوہ تھا۔ البتہ سفید فام غیر ملکیوں کی طرف عموماً اور امریکنوں کی طرف خصوصاً ان کا دل بڑے خضوع و خشوع سے فرش راہ رہتا تھا۔

ایک روز مسٹر جی۔ احمد نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا موٹا سا امریکن بیٹھا تھا۔ مسٹر جی۔ احمد نے کہا کہ یہ ہمارے ایک معزز مہمان ہیں۔ میں انہیں سٹاف کار میں اپنے ساتھ لے جا کر کراچی شہر کی سیر کرا لاؤں۔

کار میں بیٹھ کر میں نے یونہی اخلاقاً اس کا اسم شریف دریافت کیا' تو وہ بگڑ گیا' اور بڑی تیزی سے بولا۔ "تمہیں میرے نام سے کیا واسطہ؟"

"اس سے گفتگو میں آسانی ہو گی۔" میں نے وضاحت کی۔

"گفتگو کون کرنا چاہتا ہے؟" امریکن نے غصے سے کہا۔ "خیر' تمہیں اتنا ہی اصرار ہے'

For more books visit www.4Urdu.com

تو مجھے ہنری کہہ کر پکار سکتے ہو۔"

کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے دوسری غلطی یہ کی' کہ اس سے پوچھ بیٹھا' "کیا آپ صحافی ہیں؟" "مائینڈ یور اون بزنس" ہنری نے چڑ کر کہا۔

اس کے بعد ہم دونوں لب بستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ہنری کے اشارے پر ہماری کار پہلے امریکی سفارت خانے گئی۔ مجھے کار میں چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا اور کوئی ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور امریکی بھی تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا۔ دوسرا امریکن غالباً سفارت خانے میں کام کرتا تھا کیونکہ وہ کراچی شہر سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ہدایات پر ڈرائیور نے ہمیں کلفٹن' کیماڑی' بندر روڈ' ہاکس بے اور سینڈزپٹ کی سیر کرائی۔ میری موجودگی کو یکسر نظر انداز کر کے دونوں امریکی آپس میں مزے مزے کی خوش گپیاں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے صرف ایک کام کی بات میرے پلے پڑی' وہ یہ کہ امریکہ پاکستان کو گندم کی امداد دے رہا ہے۔ جب یہ گندم کراچی پہنچے گی تو جن اونٹ گاڑیوں پر لاد کر بندرگاہ سے نکالی جائے گی' ان اونٹوں کے گلے میں "تھینک یو امیرکہ" کی تختیاں آویزاں کی جائیں گی۔

یہ احمقانہ تجویز سن کر مجھے غصہ بھی آیا' رنج بھی ہوا' شرم بھی آئی۔ اس وقت تو میں چپ رہا لیکن اگلے روز سیدھا مسٹر جی۔ احمد کے پاس جا کر انہیں ساری رئیداد سنا ڈالی۔ جب میں نے اونٹوں کے گلے میں شکریے کی تختیاں لٹکانے کا مذاق اڑایا تو مسٹر جی۔ احمد یکایک سنجیدہ ہو گئے اور گرجدار آواز میں بولے۔ "تمہیں اس میں کیا ہرج نظر آتا ہے؟"

میں نے اس تجویز کے خلاف ایک چھوٹی سی جذباتی سی تقریر کی تو مسٹر جی۔ احمد کے چہرے پر بناوٹی کٹھ ہنسی کا تبسم لہرایا اور انہوں نے طنزاً کہا' گندم مانگ کر کھانے میں تو کوئی برائی نہیں لیکن شکریہ ادا کرنے کا برا مناتے ہو۔"

"نہیں سر۔ ہم تو کوئی برا نہیں مناتے' لیکن شاید اونٹ برا مان جائیں۔" گرما گرمی کی

For more books visit www.4Urdu.com

لپیٹ میں آ کر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے دیا۔

غالباً یہ بات مجھے اس طور پر نہیں کہنی چاہیے تھی۔ کیونکہ اس نے میری ذات کو مسٹر جی۔ احمد کے دماغ کے اس کابک میں بٹھا دیا جہاں پولیس والے ناپسندیدہ افراد کو رکھنے کے عادی ہیں۔ یوں بھی اس زمانے میں ماحول کا رنگ کچھ ایسا بنتا جا رہا تھا کہ امریکنوں کی کسی خفیف الحرکتی پر معمولی سا جائز اعتراض بھی بڑی آسانی سے غیر حب الوطنی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

ایک روز میری ڈیوٹی لگی کہ میں امریکی صحافیوں کے ایک گروپ کے ساتھ مغربی پاکستان کے دورے پر جاؤں۔ دورہ بڑا کامیاب رہا۔ ہم لاہور' راولپنڈی پشاور اور طورخم تک گئے۔ ہر جگہ مقامی حکام نے بڑی خاطر مدارت کی۔ صحافی بڑے خوش خوش واپس آئے۔ کراچی پہنچ کر گروپ کے لیڈر نے مجھے ایک سو ڈالر کا نوٹ پیش کیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ میرا "ٹپ" ہے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ نوٹ واپس کر دیا اور کہا کہ "ٹپ" کے حقدار تو ہوٹلوں کے بیرے اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ ایک سرکاری ملازم کو "ٹپ" کی پیشکش کرنا اس کے لیے عزت کا باعث نہیں۔ گروپ کے لیڈر نے کسی قدر جھینپ کر نوٹ واپس لے لیا۔ چند روز بعد جب میں انہیں الوداع کہنے ایئرپورٹ گیا' تو انتظار گاہ میں بیٹھ کر گروپ لیڈر نے اس مسئلہ پر میرے ساتھ کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ اب اس نے "ٹپ" "بخشش" اور "نذرانہ" کے فلسفہ کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ "ٹپ" بیروں اور خدمتگاروں کو دیا جاتا ہے۔ "بخشش" بھک منگوں کے لیے مخصوص ہے' اور "نذرانہ" سرکاری ملازمین کا حق ہے۔ اس نے بتایا کہ دو تین حضرات تو ان سے مانگ کر کچھ نذرانہ وصول کر چکے ہیں۔ ایک صاحب نے تو اپنی کسی احتیاج کا رونا رو کر ان پر پانچ سو ڈالر کے "نذرانہ" کا تاوان لگایا۔ لیکن کسی قدر مول تول کے بعد ایک سو ڈالر پر بڑی خیر سگالی سے معاملہ طے ہو گیا!

امریکہ کی مضبوط کرنسی کے ساتھ ہماری نئی نئی شناسائی بڑی تازہ دم تھی۔ ڈالر کی چکا چوند سے آنکھوں کا خیرہ ہونا تعجب کی بات نہیں۔ "ٹپ" "بخشش" اور "نذرانہ" کے

For more books visit www.4Urdu.com

اسی تانے بانے نے بین الاقوامی ایڈ اور ٹریڈ کا وہ طلسماتی جال بنا تھا' جس میں آج ہماری قوم کا بال بال کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے کے قرضہ میں بڑی بے کسی سے بندھا ہوا ہے۔

URDU4U.COM

ایک روز مسٹر جی احمد نے صبح سویرے مجھے گھر پر ٹیلیفون کیا کہ میں دفتر نہ آؤں بلکہ سیدھا ہوٹل میٹروپول چلا جاؤں۔ وہاں پر حکومت کے ایک نہایت معزز اور اہم مہمان مسٹر ہیکٹر بولیتھو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں ان کے پاس جا کر ان کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں۔ ہوٹل کے کمرے میں ایک بڑھاپے اور فربہی کی طرف مائل صاحب کسی قدر جھنجلاہٹ کے عالم میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک خوش صورت نوجوان بھی بیزار سا بیٹھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کی خدمت گزاری کے لیے حاضر ہوا ہوں تو نوجوان نے فوراً کہا۔ ٹھیک ہے' تم جلدی سے ہمارے جوتے پالش کرا دو۔"

بیرے کو بلانے کے لیے میں گھنٹی بجانے کو اٹھا تو نوجوان نے بڑے غصے سے آواز بلند کر کے کہا۔ "گھنٹی تو ہم خود بھی بجا سکتے تھے۔ تمہارے آنے سے ہماری سہولت میں کیا اضافہ ہوا؟"

میں نے نہایت فرمانبرداری سے جوتے اٹھائے اور باہر آ کر بیرے کو دیئے کہ جلدی سے اچھی طرح پالش کر دے۔ جوتے پالش ہو گئے تو میں کمرے میں واپس آ کر دوبارہ بیٹھنے ہی لگا تھا کہ نوجوان نے پھر مجھے جھڑک دیا۔ "یہاں کیوں گھستے ہو؟ تمہارے یہاں بیٹھنے سے ہمارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ تمہیں بیٹھنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر بیٹھو۔"

میں چپکے سے کان لپیٹ کر باہر آ گیا۔ برآمدے میں دیکھا کہ شیخ محمد اکرام صاحب بھی خراماں خراماں اسی کمرے کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت پاکستان کی دعوت پر مسٹر ہیکٹر بولیتھو انگلستان سے تشریف لائے ہیں اور قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح نے ان سے ملنے اور انہیں قائداعظم کے ذاتی کاغذات دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے بولیتھو صاحب

For more books visit www.4Urdu.com

کا مزاج برہم ہے۔ ہمیں ان کا "موڈ" خوشگوار رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرنا چاہیے۔
اس وقت تک میں نے مصنف کے طور پر مسٹر ہیکٹر بولیتھو کا نام سنا تک نہیں تھا۔
چند پڑھے لکھے دوستوں سے پوچھ گچھ کی' تو انہوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر
انگریزی ادب کے ایک "Who is Who" کی ورق گردانی سے منکشف ہوا کہ موصوف
سرکاری درباری قسم کے ادیب ہیں۔ چند غیر معروف ناولوں کے علاوہ انہوں نے زیادہ
تر انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد اور دیگر مختلف امرا اور روٗسا کی سوانح عمریاں تحریر
کی ہیں۔
مسٹر ہیکٹر بولیتھو صف اول کے ادیب تو نہ تھے لیکن انہیں روایتی طرز کی سوانح نگاری
پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ لیکن اس وقت بہت سے دوسروں کی طرح مجھے بھی اس
انتخاب پر مایوسی ہوئی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی غالباً یہی اعتراض تھا کہ قومی
اہمیت کے اس کام کے لیے ایک غیر ملکی شخص کو کیوں چنا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں
جب مسٹر بولیتھو کی کتاب لندن میں ایک معروف پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی تو
بے شک اس نے بیرون ملک پاکستان کو متعارف کرانے میں ضرور کسی قدر مدد دی۔"
محترمہ فاطمہ جناح کی اپنی خواہش یہی تھی کہ قائداعظم کی سوانح حیات کسی پاکستانی اہل
قلم کے ہاتھوں مرتب ہو۔ پچھلے تیس بتیس برس میں کچھ کتابیں لکھی ضرور گئی ہیں۔
قائداعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب پر بھی بہت سی فرمائشی کتابیں معرض وجود
میں آئیں۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی کتاب اردو' انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع
نہیں ہوئی جو اس عظیم رہنما کی سیرت' کردار اور سیاست کے ساتھ پورا پورا انصاف
کرتی ہو۔ قائداعظم اکیڈمی نے ایک مفصل اور مکمل سوانح حیات تیار کرنے کا منصوبہ بنا
تو رکھا ہے۔ اب دیدہ باید کہ یہ بیل کب تک' کہاں تک اور کس طرح منڈھے چڑھتی
ہے۔
مادر ملت کے ذاتی کاغذات میں البتہ ایک مسودہ ضرور موجود ہے' جس کا عنوان "Brother

For more books visit www.4Urdu.com

"My" (میرا بھائی) ہے۔ اسے انہوں نے مسٹر جی الانا کے تعاون سے تحریر کیا تھا۔ قائداعظم کی زندگی کے چند گوشوں کا یہ ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن اب تک اس کا پورا متن غالباً کہیں شائع نہیں ہوا۔ قائداعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی تھی لیکن یہ منصوبہ بھی بعض سیاسی "احتیاطوں" کی نذر ہو گیا۔ مشاہیر کے اقوال اور افعال سے اگر کسی قسم کے تنازعے کی صورت نکلتی ہو تو عصری لحاظ سے ایک محدود مدت تک انہیں صیغہ راز میں رکھنا قرین مصلحت ہے۔ لیکن تیس بتیس سال کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں متعلقہ مشاہیر تاریخ کی بے رحم بھٹی سے گزر کر اپنے اپنے مستند مقام پر مستحکم ہو چکے ہوتے ہیں۔ جزوی طور پر کسی ناخوشگوار تفصیل کا افشا ان کے اس مقام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ یوں بھی آزاد دنیا میں بہت سی جگہ تیس برس کے بعد خفیہ دستاویزات تک کو عام کر دیا جاتا ہے۔

مادر ملت کے مسودہ "میرا بھائی" میں دو مقام ایسے آتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں پس و پیش ہوتا رہا ہے۔

پہلا واقعہ جولائی ۱۹۴۸ء کا ہے' جب قائداعظم علالت کی وجہ سے علاج اور آرام کے لیے زیارت میں تشریف رکھتے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جولائی کے اخیر میں ایک روز وزیراعظم لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی اچانک زیارت پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے پوچھا کہ قائداعظم کی صحت کے متعلق ان کی تشخیص کیا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے مس فاطمہ جناح نے یہاں بلایا ہے' اس لیے وہ اپنے مریض کے متعلق کوئی بات صرف انہیں کو بتا سکتے ہیں۔

"لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے میں قائداعظم کی صحت کے متعلق متفکر ہوں۔"

ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا۔ "جی ہاں' بے شک۔ لیکن میں اپنے مریض کی اجازت

For more books visit www.4Urdu.com

کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔"

جب مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کو وزیراعظم کی آمد کی اطلاع دی' تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ "تم جانتی ہو وہ کیوں آئے ہیں؟ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری علالت کتنی شدید ہے۔ میں کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم نیچے جاؤ اور پرائم منسٹر سے کہہ دو کہ میں انہیں ابھی ملوں گا۔"

مس فاطمہ جناح نے کہا اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہ کل صبح ان سے مل لیں۔

"نہیں۔" قائداعظم نے فرمایا۔ "انہیں ابھی آنے دو' اور بچشم خود دیکھ لینے دو۔"

وزیراعظم نصف گھنٹہ کے قریب قائداعظم کے پاس رہے۔ اس کے بعد جب مس جناح اندر گئیں۔ تو قائداعظم بے حد تھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ جوس مانگا اور پھر چوہدری محمد علی کو اپنے پاس بلایا۔ سیکرٹری جنرل پندرہ منٹ تک قائداعظم کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مس فاطمہ جناح دوبارہ قائداعظم کے کمرے میں گئیں اور پوچھا کہ کیا وہ جوس یا کافی پینا پسند فرمائیں گے؟ قائداعظم نے کوئی جواب نہ دیا' کیونکہ وہ کسی سوچ میں محو تھے۔ اب ڈنر کا وقت آ گیا تھا۔ قائداعظم نے مس فاطمہ جناح سے فرمایا۔ "بہتر ہے کہ تم نیچے چلی جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں۔" مس جناح نے اصراراً کہا۔ "میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی اور یہیں پر کھانا کھا لوں گی۔"

"نہیں۔" قائداعظم نے فرمایا۔ "یہ مناسب نہیں۔ وہ یہاں پر ہمارے مہمان ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

مس فاطمہ جناح لکھتی ہیں' کہ کھانے کی میز پر انہوں نے وزیراعظم کو بڑے خوشگوار موڈ میں پایا۔ وہ ہنسی خوشی پر مذاق باتیں کرتے رہے' جبکہ مس جناح کا دل اپنے بھائی کے لیے خوف سے کانپ رہا تھا' جو اوپر کی منزل میں بستر علالت پر اکیلے پڑے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

کھانے کے دوران چوہدری محمد علی چپ چاپ کسی سوچ میں گم رہے۔
کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی مس فاطمہ جناح اوپر چلی گئیں۔ انہوں نے بڑے ضبط سے
URDU4U.COM
اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ قائداعظم انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "فطی' تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔"

اس واقعہ کے دو ڈھائی ہفتے بعد ۱۴ اگست کو پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ آئی۔
اپنی کمزوری صحت کے باوجود یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام بڑا ولولہ انگیز پیغام جاری کیا۔ مس جناح نے اپنے مسودے میں لکھا ہے کہ یوم پاکستان کے چند روز بعد وزیر خزانہ مسٹر غلام محمد قائداعظم سے ملنے کوئٹہ آئے۔ لنچ کے وقت جب مس فاطمہ جناح ان کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھیں' تو مسٹر غلام محمد نے کہا۔ "مس جناح میں ایک بات آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام جو پیغام دیا تھا' اسے خاطر خواہ اہمیت اور تشہیر نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس وزیراعظم کے پیغام کے پوسٹر چھاپ کر انہیں شہر شہر دیواروں پر چسپاں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ اسے بڑے بڑے شہروں پر پھینک کر منتشر بھی کیا گیا ہے۔"
مس جناح نے یہ بات خاموشی سے سن لی۔ کیونکہ اس وقت انہیں اپنے بھائی کی صحت کی فکر تھی' پبلسٹی کی نہیں۔

مسٹر غلام محمد کی اس حرکت میں کھلم کھلا شر' شرارت اور سازش کی آمیزش تھی۔
قائداعظم بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح ان کی تیمارداری میں پریشان تھیں۔ ایسے حالات میں اس قسم کی لگائی بجھائی کرنا بڑی مذموم حرکت تھی۔ اگر مسٹر غلام محمد کو واقعی ایسی کوئی شکایت تھی تو ان کا فرض تھا کہ اس بات کو کابینہ میں اٹھاتے۔
اگر اس کے باوجود ان کا گلہ قائم رہتا تو اصولی طور پر انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

لیکن اصولوں پر استعفیٰ دینا ہمارے حکمرانوں کی کمزوری نہیں۔ غلط فہمیاں پیدا کر کے اختلافات کو ہوا دینا انہیں زیادہ راس آتا ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو مسٹر غلام محمد کے ان ذاتی رجحانات کی غمازی کرتا ہے جنہوں نے آگے چل کر ملک کے کاروبار میں کئی اور گل کھلانے تھے۔ دوسری طرف اس سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی زندگی کے پہلے سال سے مرکزی کابینہ میں ایسے عناصر نے سر اٹھا لیا تھا جو وزیراعظم کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف عمل تھے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ مس فاطمہ جناح اور حکومت کے درمیان سرد مہری کا غبار چھایا رہا۔ قائد کی دو برسیاں آئیں اور گزر گئیں دونوں بار مس جناح نے برسی کے موقع پر قوم سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی شرط تھی کہ براڈ کاسٹ کرنے سے پہلے وہ اپنی تقریر کا متن کسی کو نہیں دکھائیں گی۔ حکومت یہ شرط ماننے پر آمادہ نہ تھی۔ غالباً اسے خوف تھا کہ نہ جانے مس جناح اپنی تقریر میں حکومت پر کیا کچھ تنقید کر جائیں گی۔ آخر خدا خدا کر کے قائداعظم کی تیسری برسی پر یہ قرار پایا کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقریر پہلے سے سنسر کرائے بغیر ریڈیو سے براہ راست نشر کر سکتی ہیں۔ تقریر نشر ہو رہی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر اچانک ٹرانسمشن بند ہو گئی۔ کچھ لمحے ٹرانسمشن بند رہی۔ اس کے بعد خودبخود جاری ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مس جناح کی تقدیر میں کچھ فقرے ایسے تھے جن میں حکومت پر کچھ تنقید تھی۔ وہ تو بدستور ان فقروں کو مائک پر پڑھتی گئیں' لیکن ٹرانسمشن بند ہو جانے کی وجہ سے وہ فقرے براڈ کاسٹ نہ ہو سکے۔ اس بات پر بڑا شور شرابا ہوا۔ اخباروں میں بہت سے احتجاجی بیانات بھی آئے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان کا موقف یہی تھا کہ ٹرانسمشن میں رکاوٹ کی وجہ یہ تھی کہ اچانک بجلی فیل ہو گئی تھی' لیکن کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مس جناح کی تقریر میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جسے حذف کرنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ اس ایک واقعہ نے حکومت

For more books visit www.4Urdu.com

کے اعتماد کو جتنی ٹھیس پہنچائی اتنا نقصان مس فاطمہ جناح کے چند تنقیدی جملوں سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جن دنوں یہ قضیہ اپنے عروج پر تھا' ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیر داخلہ و اطلاعات کے کمرے میں یہ بات طے کرنے کے لیے میٹنگ ہوئی کہ اس قصے کے متعلق پبلک میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں' ان پر کس طرح قابو پایا جائے۔ بے حد طویل اور بعید از کار بحث و تمحیص کے بعد آخر مسٹر جی۔ احمد نے تجویز پیش کی کہ کسی نامور شخصیت سے انکوائری کروا کے یہ ثابت کیا جائے کہ مس جناح کے براڈ کاسٹنگ کے دوران بجلی کی کرنٹ فیل ہو گئی تھی۔ اس انکوائری رپورٹ کی اشاعت کے بعد زبان خلق خود بخود بند ہو جائے گی اس کے برعکس وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کو اصرار تھا کہ انکوائری بے لاگ اور غیر جانب دار ہونی چاہیے۔ اگر یہ ثابت ہو کہ بجلی فیل نہیں ہوئی تو اس بات کا بھی برملا اعتراف کرنا ضروری ہے تاکہ پبلک کے ذہن میں مزید بدگمانیاں پیدا نہ ہوں۔ سیکرٹری اور وزیر کے درمیان اس بحث کی تلخ کلامی نے بڑا طول کھینچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب بھی یہی سمجھتے تھے کہ بجلی فیل نہیں ہوئی' اور اب وہ اس بات کو کھلم کھلا منظر عام پر لانے کے لیے بے تاب تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں کی حکومت کے لیے وہ اس قسم کی پریشانیاں اور مشکلات کیوں پیدا کرنا چاہتے تھے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان دنوں یہ افواہ گرم تھی کہ وزیراعظم انہیں مرکزی کابینہ سے سبکدوش کر کے مشرقی بنگال بھیجنا چاہتے ہیں۔

ان دنوں مرکزی کابینہ سے علیحدگی کی تلوار خواجہ صاحب کے علاوہ اور بھی کئی سروں پر لٹک رہی تھی۔ وزیر خزانہ ملک غلام محمد پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ خرابی صحت کی بنا پر کابینہ سے ان کی رخصتی متوقع تھی۔ نواب مشتاق احمد گرمانی آزاد کشمیر کی سیاست میں پیچ در پیچ الجھنیں ڈال کر کشمیری لیڈروں کو آپس میں دست و گریبان کرانے کا گل کھلا چکے تھے۔ اب وزارت امور کشمیر میں کشمیر تو غائب ہو چکا تھا' فقط امور ہی

For more books visit www.4Urdu.com

امور باقی رہ گئے تھے۔ کچھ گفتنی' کچھ ناگفتنی۔ چنانچہ افواہ گرم تھی کہ عنقریب گرمانی صاحب بھی کابینہ سے چھٹی کرنے والے ہیں۔ یہ حضرات تو کینٹ سے نکالے جانے والے خوف میں مبتلا تھے' لیکن ایک حضرت ایسے بھی تھے جو کابینہ میں شامل کئے جانے پر برہم و آزردہ مشہور تھے۔ ان کا نام نامی خان عبدالقیوم خاں تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے طور پر وہ فرنٹیر کے "مرد آہن" کہلاتے تھے۔ وہاں سے اٹھا کر جب انہیں مرکزی کابینہ میں ڈال دیا گیا تو انتظامی اور عاملانہ امور کے علاوہ وہ اپنی سیاسی اساس سے بھی دور ہو گئے۔ یوں بھی ایک طاقتور صوبائی وزیر اعلیٰ کا ٹھاٹھ باٹھ کچھ اور ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں مرکز کی وزارت چیزے دگر۔ اس لیے عام اطلاع یہی تھی کہ وہ اپنی اس "ترقی" سے چنداں خوش نہیں تھے۔

اس قسم کی افواہوں' قیاس آرائیوں اور خبر تراشیوں کی گرم بازاری اپنے عروج پر تھی کہ یکایک آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی شام کو چار بج کر چھ منٹ پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں ایک گولی چلی اور اس نے پاکستان کی قیادت کو سیاست کی شاہراہ سے موڑ کر موقع پرستی' ابن الوقتی' زمانہ سازی' طالع آزمائی اور مہم جوئی کے ایسے خارزار میں ڈال دیا جہاں ذاتی خواہشات قومی ضرورت اور ذاتی مفاد' قومی مفاد کے مترادفات بنتے چلے گئے۔

قائد ملت لیاقت علی خاں نے جام شہادت نوش کر کے تب و تاب جاودانہ کا صلہ پایا۔ جلسہ گاہ میں راولپنڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نجف خاں نے اپنے سپاہیوں کو للکار کر حکم دیا کہ گولی چلانے والے قاتل کو فوراً مار ڈالو۔ سید اکبر بھی گولی کا نشانہ بن کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راز بھی دفن ہو گیا کہ وہ راولپنڈی کیوں آیا؟ ہر طرح کی سیکیورٹی کے باوجود جلسے کی اگلی صفوں تک کیسے رسائی حاصل کی؟ کسی غیبی طاقت یا روحانی یا شیطانی یا انسانی اشارے نے اس کی انگلی پستول کی لبلبی پر رکھ کر دبا دی؟ اسے زندہ گرفتار کرنے کی بجائے پولیس والوں نے اسے خواہ مخواہ جلسہ گاہ میں مار کیوں ڈالا؟ اس بے ضابطہ کاروائی کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف کیا کروائی

For more books visit www.4Urdu.com

ہوئی؟ اسے ڈی۔ آئی۔ جی کے عہدے پر ترقی کس کارگزاری کے صلے میں ملی؟ عامی ذہن میں یہ سوال آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ اب تک کسی ایسی بے لاگ انکوائری کا نتیجہ برسر عام نہیں آیا' جو ان سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ قائد ملت کی ہر برسی پر کسی نہ کسی پیرائے میں ایک مکمل اور بھرپور انکوائری کا مطالبہ اٹھتا ہے اور پھر اگلی برسی تک طاق نسیاں کی زینت بن جاتا ہے۔ درمیانی عرصہ میں وہی پرانے شکوک و شبہات خاموشی سے نشوونما پاتے رہتے ہیں اور اجتماعی رگ و ریشے میں بے اعتمادی کا سرطان پھیلاتے رہتے ہیں۔

URDU4U.COM

خان لیاقت علی خاں کی شہادت نے پاکستان سے اس کا پہلا وزیراعظم ہی نہیں چھینا بلکہ ہمیں ایک نہایت بلند پایہ مدبر' سیاست دان اور انتظامی اور انصرامی قابلیت کے رہنما سے بھی محروم کر دیا۔ تحریک پاکستان میں وہ قائداعظم کے دست راست تھے۔ اس حیثیت میں انہیں مسلمانوں کی تنظیم اور انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ سیاسی نبرد آزمائی کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس نوزائیدہ ملک کو چاروں طرف سے انتہائی شدید مصائب نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک نئی حکومت کا قیام' مسلح افواج کی تنظیم نو' لاکھوں مہاجرین کی آباد کاری' بھارت کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وسائل کا فقدان اور پھر کشمیر کی جنگ آزادی کا آغاز------ اس قسم کے بے شمار سنگین مسائل کو نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بڑے تدبر' تحمل اور انتظامی قابلیت سے سنبھالا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کی قیادت کا سارا بوجھ لیاقت علی خان صاحب کے کندھوں پر ہی آ پڑا تھا۔ اس بارگراں کو بھی انہوں نے بعنوان شائستہ اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وزارت عظمیٰ کو دور پاکستان کے لیے استحکام' استقلال اور سر بلندی کا زمانہ تھا۔ لیکن دو ایسی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے' جنہوں نے ہمارے حالات پر منفی اثرات مرتب کیے۔

اس زمانے میں پاکستان اسلامی دنیا میں سب سے بڑا اور ساری دنیا میں پانچواں بڑا ملک